

الانبیاء

نام | اس سورت کا نام کسی خاص آیت سے ماخوذ نہیں ہے۔ چونکہ اس میں مسائل بہت سے انبیاء کا ذکر آیا ہے، اس لیے اس کا نام ”انبیاء“ رکھ دیا گیا۔ یہ بھی موضوع کے لحاظ سے سورت کا عنوان نہیں ہے بلکہ محض پہچاننے کے لیے ایک علامت ہے۔

زمانہ نزول | مضمون اور انداز بیان۔ دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ نزول مکہ کا دور متوسط، یعنی ہماری تقسیم کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا تیسرا دور ہے۔ اس کے منظر میں حالات کی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو آخری دور کی مسندوں میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ موضوع و مضمون | اس سورہ میں وہ کشمکش زیر بحث ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سردارانِ قریش کے درمیان برپا تھی۔ وہ لوگ آنحضرت کے دعوائے رسالت اور آپ کی دعوتِ نو عید و عقیدہ آخرت پر جو شکوک اور اعتراضات پیش کرتے تھے ان کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے آپ کی مخالفت میں جو چالیں چلی جا رہی تھیں ان پر زبرد توہین کی گئی ہے اور ان حرکتوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ وہ جس غفلت اور بے پروائی سے آپ کی دعوت کا استقبال کر رہے تھے اُس پر تنبیہ کیا گیا ہے اور آخر میں ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جس شخص کو تم اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھ رہے ہو وہ دراصل تمہارے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔

عنوانِ تقریر میں خاص طور پر جو امور زیر بحث آئے ہیں وہ یہ ہیں :-

۱۔ کفار مکہ کی یہ غلط فہمی کہ بشر کبھی رسول نہیں ہو سکتا اور اس بنا پر ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے سے انکار کرنا۔ اس کا بڑی تفصیل کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔

۲۔ اُن کا آپ پر اور قرآن پر مختلف اور متضاد قسم کے اعتراضات کرنا اور کسی ایک بات پر زہمنا۔

— اس پر مختصر مگر نہایت پُر زور اور حسی خیر طریقے سے گرفت کی گئی ہے۔

۳۔ اُن کا یہ نعت کہ زندگی بس ایک کھیل ہے جسے چند روزہ کھیل کر یہ نہی ختم ہو جانا ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ہے۔ کسی حساب کتاب اور جزا و سزا سے سابقہ نہیں پیش آتا ہے۔ — یہ چیز جو کہ اُس غفلت و بے اعتنائی کی اصل جڑ تھی جس کے ساتھ مہدی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا استقبال کر رہے تھے، اس لیے بڑے ہی مؤثر انداز میں اس کا توڑ کیا گیا ہے۔

۴۔ شرک پر ان کا اصرار اور توحید کے خلاف ان کا باطلانہ تعصب جو ان کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اصل بنائے نزع تھا۔ — اس کی اصلاح کے لیے شرک کے خلاف اور توحید کے حق میں مختصر مگر بہت وزنی اور دلنشین دلائل دیئے گئے ہیں۔

۵۔ ان کی یہ غلط فہمی کہ نبی کو بار بار بھیٹلانے کے باوجود اُن پر کوئی عذاب نہیں آتا تو مزدوری جھوٹا ہے اور عذاب الہی کی وہ وعیدیں جو وہ خدا کی طرف سے ہیں سناٹے محض خالی خلی و حکمیاں ہیں۔ — اس کو استدلال اور تسبیحیت، دونوں طریقوں سے رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کے اہم واقعات سے چند نظریں پیش کی گئی ہیں جن سے یہ سمجھنا مقصود ہے کہ تمام وہ پیغمبر جو انسانی تاریخ کے دوران میں خدا کی طرف سے آئے تھے، انسان تھے اور نبوت کے امتیازی وصف کو چھوڑ کر دوسری صفات میں وہ ویسے ہی انسان ہوتے تھے جیسے دنیا کے عام انسان ہوا کرتے ہیں۔ اللہ بہیت اور خدا کا ان میں شائبہ نہ تھا بلکہ اپنی برزوردست کے لیے وہ خود خدا کے آگے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ اس کے ساتھ انہی تاریخی نظیروں سے دو باتیں اور بھی خارج کی گئی ہیں ایک یہ کہ انبیاء پر طرح طرح کے مصائب آتے ہیں، اور ان کے مخالفین نے بھی ان کو براہ کرنے کی کوششیں کی ہیں، مگر آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی طریقوں پر ان کی نصرت فرمائی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ تمام انبیاء کا دین ایک تھا اور وہ وہی دین تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں خدیج انسانی کا اصل دین یہی ہے، اور باقی جتنے مذاہب دنیا میں بنے ہیں وہ محض گمراہ انسانوں کے ڈالے ہوئے تفرقتے ہیں۔

آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی نجات کا انحصار اسی دین کی پیروی اختیار کرنے پر ہے۔ جو لوگ اسے قبول کریں گے وہی خدا کی آخری عدالت سے کامیاب نکلیں گے اور زمین کے وارث ہوں گے۔ اور جو لوگ اسے رد کر دیں گے وہ آخرت میں بدترین انجام سے دوچار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ بڑی مہربانی ہے کہ وہ فیصلے کے وقت سے پہلے اپنے نبی کے ذریعہ سے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو نبی کی آمد کو اپنے لیے رحمت کے بجائے زحمت سمجھ رہے ہیں۔

اللہ کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے

قریب آنگاہ ہے لوگوں کے حساب کا وقت، اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس جو تازہ نصیحت بھی ان کے رب کی طرف سے آتی ہے، اس کو مختلف سنتے ہیں اور مکمل میں پڑے رہتے ہیں، دل ان کے رد و سری ہی فکر میں، منہک ہیں۔

۱۔ مراد ہے قریب قیامت یعنی اب وہ وقت دور نہیں ہے جب لوگوں کو اپنا حساب دینے کے لیے اپنے رب کے آگے حاضر ہونا پڑے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس بات کی علامت ہے کہ نوع انسانی کی تاریخ اب اپنے آخری دور میں داخل ہو رہی ہے۔ اب وہ اپنے آغاز کی بنسبت اپنے انجام سے قریب تر ہے۔ آغاز اور وسط کے مرحلے گزر چکے ہیں اور آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔ یہی مضمون ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ آپ نے اپنی دو انگلیاں کھڑی کر کے فرمایا بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ ۚ میں ایسے وقت پر مبعوث کیا گیا ہوں کہ میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں، یعنی میرے بعد قیامت ہی ہے۔ کسی اور نبی کی دعوت پہنچ میں حامل نہیں ہے۔ سنبھلنا ہے تو میری دعوت پر سنبھل جاؤ۔ کوئی اور راہ دی اور شیر و فیل پر آسنے والا نہیں ہے۔

۲۔ یعنی کسی تنبیہ کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ نہ خود سوچتے ہیں کہ پہلا انجام کیا ہونا ہے اور نہ اس پیغمبر کی بات سنتے ہیں جو انہیں خبردار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

۳۔ یعنی قرآن کی ہر نئی سورت جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی ہے اعدائے انہیں سنائی جاتی ہے۔

اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص آخر تم جیسا ایک بشری تو ہے، پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جاؤ کہ چھندے میں چھپس جاؤ گے؟

لَعَنَهُمُ الْيَتِيمُونَ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اوپر ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے، اور اس میں کھیل سے مراد یہی زندگی کا کھیل ہے جسے خدا اور آخرت سے غافل لوگ کھیل رہے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے سنجیدگی کے ساتھ نہیں سنتے بلکہ کھیل اور مذاق کے طور پر سنتے ہیں۔

۷۷ پھنسے جاتے ہو۔ یہی ترجمہ ہو سکتا ہے، لَعَنَهُمُ ذُنُوبُہُمُ ہی مطلب صحیح ہیں۔ سرگوشیاں کفار مکہ کے وہ بڑے بڑے سردار آپس میں بیٹھ بیٹھ کر کیا کرتے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کرنے کی بڑی نکر لاقی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص بہر حال نبی تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ ہم ہی جیسا انسان ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، بیری بچے رکھتا ہے۔ آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جو اس کو ہم سے ممتاز کرتی ہو۔ اور ہماری نسبت اس کو خدا سے ایک غیر معمولی تعلق کا مستحق بناتی ہو۔ البتہ اس شخص کی باتوں میں اور اس کی شخصیت میں ایک جادو ہے کہ جو اس کی بات کان لگا کر سنتا ہے اور اس کے قریب جاتا ہے وہ اس کا گرد و پودہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو نہ اس کی سنو اور نہ اس سے میل جول رکھو، کیونکہ اس کی باتیں سننا اور اس کے قریب جانا گویا آنکھوں دیکھتے جاؤ کہ چھندے میں پھنسا ہے۔

جس چیز کی وجہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کا الزام چسپاں کرتے تھے اس کی چند مثالیں آپ کے قدیم ترین میرت نگار محمد بن اسحاق (متوفی ۲۴۱ھ) نے بیان کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ عتبہ بن ربیعہ نے سردار ابن قریش سے کہا، اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں محمد سے جا کر ملوں اور اسے سمجھانے کی کوشش کروں۔ یہ حضرت حمزہ کے اسلام لانے کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تعداد روز بروز بڑھتے دیکھ کر ان کا بڑبڑاہٹ سخت پریشان ہو رہے تھے۔ لوگوں نے کہا ابوالولید، تم پر پیدا اطمینان ہے، ضرور جا کر اس سے بات کرو۔ وہ حضور کے پاس پہنچا اور کہنے لگا، بیٹھے، ہمارے ہاں تم کو جو عزت حاصل تھی، تم خود جانتے ہو، اور نسب میں بھی تم ایک شریف ترین گھرانے کے فرد ہو تم اپنی قوم پر یہ کیا مصیبت لے آئے ہو؟ تم نے جامعیت میں تفرقہ ڈال دیا اور ان قوم کو بے وفور و ٹھیکہ ریا۔ اس کے دین اور اس کے محبوبوں کی بھائی کی۔ باپ و امرا جو مرچکے ہیں ان سب کو تم نے

گمراہ اور کافر بنایا۔ نتیجہ اگر ان باتوں سے تمہارا مقصد دنیا میں اپنی بڑائی قائم کرنا ہے تو اوہم سب مل کر تم کو اتنا روپیہ دے دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ سرداری چاہتے ہو تو ہم تمہیں سردار مانے لیتے ہیں۔ بادشاہی چاہتے ہو تو بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ اور اگر تمہیں کوئی بیماری ہو گئی ہے جس کی وجہ سے تم کو دوائی سوتے یا جلتے ہیں کچھ نظر آنے لگا ہے تو ہم سب مل کر بہترین طبیعوں سے تمہارا علاج کرائے دیتے ہیں۔ یہ باتیں وہ کرتا رہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش سنتے رہے۔ جب وہ خوب بول چکا تو آپ نے فرمایا: ابوالولید، جو کچھ آپ کہنا چاہتے تھے کہہ چکے ہیں، یا اور کچھ کہنا ہے؟ اس نے کہا: بس جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔ آپ نے فرمایا: اچھا اب میری سنو، بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ حکم، تنزیل من الرحمن الرحیم۔ اس کے بعد کچھ دیر تک مسلسل آپ سورۃ الفتح السجدہ کی تلاوت فرماتے رہے اور عتبہ پیچھے زمین پر ہاتھ ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ اترتھیں آیت پر پہنچ کر آپ نے سجدہ کیا، اور پھر سر اٹھا کر عتبہ سے فرمایا: ابوالولید، جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ آپ نے سن لیا۔ اب آپ جانیں لو آپ کا کام: عتبہ یہاں سے اٹھ کر سر ملان قریش کی طرف پٹا تو لوگوں نے دُور سے ہی اس کو آنے دیکھ کر کہا: خدا کی قسم، ابوالولید کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر وہ گیا تھا: اُس کے پیچھے ہی لوگوں نے سوال کیا: کہہ ابوالولید، کیا کر آئے؟ اُس نے کہا: خدا کی قسم، آج میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ واللہ یہ شتر نہیں ہے، نہ سحر ہے، اور نہ کہانت۔ اُسے معشر قریش، میری بابت مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس کی باتیں جو میں نے سنی ہیں رنگ لا کر رہیں گی۔ اگر عرب اس پر غالب آگئے تو اپنے خیالی کاغذوں تمہاری گردن پر ہوگا، دو سروں پر ہوگا۔ اور اگر یہ عرب پر غالب آگیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہوگی اور اس کی عزت تمہاری عزت۔ لوگوں نے کہا: واللہ، ابوالولید تم پر بھی اس کا جادو چل گیا۔ اس نے کہا: یہ میری رائے ہے، اب تم جانو اور تمہارا کام: (ابن مہتمام، جلد اول، ص ۳۱۳-۳۱۴) یہی ہے اس واقعہ کے متعلق جو روایات جمع کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب حضور سورۃ الفتح السجدہ کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچے کہ فَإِنْ أَعْرَفْتُمْوَأَفْعَلْ أَنْذَرْتُمْكُمْ ضِعْفَةً مِثْلَ صَاعِقَةٍ عَادَ وَنُفُودَ، تو عتبہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا کہ خدا کے لیے اپنی قوم پر رحم کرو۔

رسول نے کہا میرا رب ہر اس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے، وہ سمیع اور علیم ہے۔

دوسرا واقعہ ابن اسحاق نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ قبیلۂ اراش کا ایک شخص کچھ اونٹ لے کر مکہ آیا۔ ابو جہل نے اس کے اونٹ خرید لیے اور جب اس نے قیمت طلب کی تو مال ٹمول کرنے لگا۔ اراشی نے تنگ آکر ایک روز حرم کعبہ میں قریش کے سرداروں کو جا پکڑا اور مجمع عام میں خرابی شروع کر دی۔ دوسری طرف حرم کے ایک گوشے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سردار بن قریش نے اس شخص سے کہا: ہم کچھ نہیں کر سکتے، دیکھو وہ صاحب جو اس کو نے میں بیٹھے ہیں، ان سے جا کر کہو، وہ تم کو تیار روپیہ دلوا دیں گے۔ اراشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا، اور قریش کے سرداروں نے آپس میں کہا: آج لطف آئے گا۔ اراشی نے جا کر حضور سے اپنی شکایت بیان کی آپ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر ابو جہل کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ سرداروں نے پیچھے ایک آدمی لگا دیا کہ جو کچھ گندے اس کی خبر لا کر دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ابو جہل کے دروازے پر پہنچے اور گنڈی کھٹکھٹائی۔ اس نے پوچھا: کون؟ آپ نے جواب دیا: محمدؐ۔ وہ حیران ہو کر باہر نکل آیا۔ آپ نے اس سے کہا: اس شخص کا حق ادا کرو۔ اس نے جواب میں کوئی چوہا نہ دیا، اندر گیا اور اس کے اونٹوں کی قیمت لاکر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ قریش کا مخبر یہ حال دیکھ کر حرم کی طرف دوڑا اور سرداروں کو سارا ماجرا سنا دیا اور کہنے لگا کہ واللہ آج وہ عجیب معاملہ دیکھا جو کبھی نہ دیکھا تھا، حکم بن ہشام (ابو جہل) جب نکلا ہے تو محمدؐ کو دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا اور جب محمدؐ نے اس سے کہا کہ اس کا حق ادا کرو تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے حکم بن ہشام کے جسم میں جان نہیں ہے۔ (ابن ہشام، جلد ۲، ص ۲۹-۳۰)

یہ تھا شخصیت اور سیرت و کردار کا اثر اور وہ تھا کلام کا اثر، جس کو وہ لوگ جادو قرار دیتے تھے اور تاوانف لوگوں کو یہ کہہ کہہ کر ڈراتے تھے کہ اس شخص کے پاس نہ جانا ورنہ جادو کر دے گا۔

یعنی رسول نے کبھی اس مجھوٹے پروپیگنڈے اور سرگوشیوں کی اس مہم (WHISPERING CAMPAIGN) کا جواب اس کے سوا نہ دیا کہ تم لوگ جو باتیں بتاتے ہو سب کچھ خدا سنتا اور جانتا ہے، خواہ زور سے کہو، خواہ چپکے چپکے کانوں میں چھونکو۔ وہ کبھی بے انصاف، دشمنوں کے مقابلے میں ترکی ترکی جواب دینے پر نہ اتر آیا۔

وہ کہتے ہیں ”بلکہ یہ پرانگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ اس کی من گھڑت ہے، بلکہ یہ شخص شاعر ہے۔“ ورنہ
 اے اس کا پس منظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا اثر جب پھیلنے لگا تو مکہ کے سرداروں نے آپس میں
 مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپ کے مقابلے میں پروپیگنڈا کی ایک مہم شروع کی جائے اور ہر اس شخص کو جو مکہ میں زیارت
 کے لیے آئے، آپ کے خلاف پہلے ہی سے اتنا بدگمان کر دیا جائے کہ وہ آپ کی بات سننے کے لیے آمادہ ہی نہ
 ہو۔ یہ مہم ویسے تو بارہ چھینے بیاری رہتی تھی، مگر خاص طور پر حج کے زمانے میں کثرت سے آدمی پھیلا دیتے جاتے
 تھے جو تمام بیرونی زائرین کے خیموں میں پہنچ کر ان کو خبردار کرتے پھرتے تھے کہ یہاں ایسا ایسا ایک آدمی ہے اس
 سے ہوشیار رہنا۔ ان گفتگوؤں میں طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی تھیں۔ کبھی کہا جاتا کہ یہ شخص جادوگر ہے کبھی کہا جاتا
 کہ ایک کلام اس نے خود گھڑ رکھا ہے اور کہنا ہے خدا کا کلام ہے کبھی کہا جاتا کہ اچھا وہ کلام کیا ہے، دیوانوں کی
 بڑی اور پرانگندہ خیالات کا پند ہے کبھی کہا جاتا کہ شاعرانہ خیالات اور تک بندیاں ہیں جن کا نام اُس نے کلام الہی
 رکھا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو بہکایا جائے۔ صداقت کا ان کے سامنے سرے سے کوئی سوال
 ہی نہ تھا کہ ہم کو کوئی قطعی اور چھٹی رائے ظاہر کرتے۔ لیکن اس جھوٹے پروپیگنڈے کا حاصل جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام انہوں نے خود ملک کے گوشے گوشے میں پھیل دیا۔ آپ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی
 کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہو سکتی تھی وہ قریش کی اس مخالفانہ مہم سے تھوڑی مدت ہی کے اندر ہو گئی۔
 ہر شخص کے دل میں ایک سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو رہا ہے کہ ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان برپا
 ہے، اور بہت سے سوچنے والوں نے سوچا کہ اس شخص کی بات سنی تو جائے، ہم کوئی نیچے تو نہیں ہیں کہ خواہ
 مخواہ بہک جائیں گے۔

اس کی ایک دلچسپ مثال طفیل بن عمرو دوسی کا قصہ ہے جسے ابن اسحاق نے خود ان کی روایت سے بڑی
 تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلہ دوس کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکہ گیا۔ وہاں پہنچتے
 ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف خوب میرے کان بھرے یہاں تک کہ
 میں آپ سے سخت بدگمان ہو گیا اور میں نے طے کر لیا کہ آپ سے بچ کر ہی رہوں گا۔ دوسرے روز میں نے حرم
 میں ماضی دی تو آپ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ میرے کانوں میں چند جملے جو پڑے تو میں نے محسوس کیا

یہ لائے کوئی نشانی جس طرح پرانے زمانے کے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ حالانکہ ان سے کہ یہ تو کوئی بڑا اچھا کلام ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں شاعر ہوں، جوان مرد ہوں، عقل رکھتا ہوں، کوئی تجربہ نہیں ہوں کہ صبح اور غلط میں تمیز نہ کر سکوں۔ آخر کیوں نہ اس شخص سے مل کر معلوم کروں کہ یہ کہتا کیا ہے۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر واپس چلے تو میں آپ کے پیچھے پیچھے ہو گیا اور آپ کے مکان پر پہنچ کر میں نے عرض کیا کہ آپ کی قوم نے آپ کے متعلق مجھ سے یہ یہ کچھ کہا تھا، اور میں آپ سے اس قدر بدگمان ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے کانوں میں روٹی ٹھونس لی تھی تاکہ آپ کی آواز نہ سننے پاؤں۔ لیکن ابھی جو چند کلمے میں نے آپ کی زبان سے سنے ہیں وہ مجھے کچھ اچھے معلوم ہوئے۔ آپ مجھے ذرا تفصیل سے بتائیے، آپ کیا کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں مجھ کو قرآن کا ایک حصہ سنایا اور میں اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت ایمان لے آیا۔ پھر واپس جا کر میں نے اپنے باپ اور بیوی کو مسلمان کیا۔ اس کے بعد اپنے قبیلے میں مسلسل اشاعت اسلام کرتا رہا، یہاں تک کہ غزوہ خندق کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے میرے قبیلے کے شرابی گھرانے مسلمان ہو گئے۔ (جلد ۲، ص ۲۲-۲۳)

ایک اور روایت جو ابن اسحق نے نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سردارانِ قریش اپنی محفلوں میں خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ جو باتیں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بتاتے ہیں وہ محض جھوٹ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مجلس میں نضر بن حارث نے تقریر کی کہ تم لوگ محمدؐ کا مقابلہ جس طرح کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔ وہ جب تمہارے درمیان تو عمر جوان تھا تو تمہارا سب سے زیادہ خوش اطوار آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امین سمجھا جاتا تھا۔ اب کہ اس کے بال سفید ہونے کو لگے، تم کہتے ہو یہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ بخدا، وہ ساحر نہیں ہے، ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے اور ان کی جھار چوڑک سے ہم واقف ہیں۔ بخدا وہ کاہن بھی نہیں ہے، ہم نے کاہنوں کی تک بندیاں سنی ہیں اور حبیبی گول مول باتیں وہ کیا کرتے ہیں ان کا ہمیں علم ہے۔ بخدا وہ مجنون بھی نہیں ہے، مجنون کی جو حالت ہوتی ہے اور حبیبی بے تکی بڑوہ لاکھتا ہے کیا اس سے ہم بے خبر ہیں۔ اے سردارانِ قریش، کچھ اور بات سوچو، جس چیز کا مقابلہ نہیں کر سکتے وہ اس سے زیادہ بڑی ہے کہ یہ باتیں بنا کر تم اسے شکست دے سکو۔ اس کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی کہ غم سے

پہلے کوئی بستی بھی، جسے ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہ لائی۔ اب کیا یہ ایمان لائیں گے؟
اور اے محمد، تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ اُن رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں، اور زورہ سدا جینے والے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ آخر کار ہم نے ان کے ساتھ اپنے دوسرے رسول بھی بھیجے، اور انہیں رسولوں کو ہم نے چاہا بچا لیا، اور عدسے گزر جانے والوں

رستم اور اسفندیار کے قصے لاکر پھیلانے جائیں تاکہ لوگ ان میں دلچسپی لینے لگیں اور وہ انہیں قرآن سے زیادہ عجیب معلوم ہوں چنانچہ کچھ دنوں اس پر عمل کیا گیا اور خود نضر نے داستان کوئی شروع کر دی۔ (ابن ہشام - جلد اول ص ۲۲۰-۲۲۱)

۱۰۔ اس مختصر سے جملے میں نشانی کے مطالبے کا جو جواب دیا گیا ہے وہ تین مضمونوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ تم پچھلے رسولوں کی سی نشانیاں مانگتے ہو، مگر یہ بھول جاتے ہو کہ ہرٹ و حرم لوگ ان نشانوں کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تھے۔ دوسرے یہ کہ تم نشانی کا مطالبہ تو کرتے ہو، مگر یہ یاد نہیں رکھتے کہ جس قوم نے بھی مریخ معجزہ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ایمان لانے سے انکار کیا ہے وہ پھر ہلاک ہوئے بغیر نہیں رہی ہے تیسرے یہ کہ تمہاری منہ مانگی نشانی نہ بھیجنا تو تم پر خدا کی ایک بڑی مہربانی ہے۔ اب تک تم انکار پر انکار کیے جاتے رہے اور تھلائے عذاب نہ ہوئے۔ کیا اب نشانی اس لیے مانگتے ہو کہ ان قوموں کا سارا انجام دیکھو جو نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائیں اور تباہ کر دی گئیں؟

۱۱۔ یہ جواب ہے اُن کے اس قول کا کہ یہ شخص تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کو اس بات کی دلیل قرار دیتے تھے کہ آپ نبی نہیں ہو سکتے۔ جواب دیا گیا کہ پہلے زمانے کے جن لوگوں کو تم خود ماننے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے، وہ سب بھی بشر ہی تھے اور بشر ہونے ہوئے ہی خدا کی وحی سے سرفراز ہوئے تھے۔

۱۲۔ یعنی یہ یہودی، جو آج اسلام کی دشمنی میں تمہارے ہم نوا ہیں اور تم کو مخالفت کے دائرہ میں رکھا کرتے

کو ہلاک کر دیا۔

لوگو، ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟

کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا اور ان کے بعد دوسری کسی قوم کو اٹھایا جب ان کو سہارا عذاب محسوس ہوا تو لگے سر پٹ دوڑنے۔ (کہا گیا،) ”بھاگو نہیں۔ جاؤ اپنے انہی گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے، شاید کہ تم سے پوچھا جائے“ کہنے لگے

ہیں، انہی سے پوچھ لو کہ موسیٰ اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کون تھے۔ انسان ہی تھے یا کوئی اور مخلوق؟

ﷺ یعنی کچلی تاریخ کا سبق صرف اتنا ہی نہیں بتانا کہ پہلے جو رسول بھیجے گئے تھے وہ انسان تھے، بلکہ یہ بھی بتانا ہے کہ ان کی نصرت و تائید کے، اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو ہلاک کر دینے کے، جتنے وعدے اللہ نے ان سے کیے تھے وہ سب پورے ہوئے اور ہر وہ قوم برباد ہوئی جس نے ان کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ اب تم اپنا انجام خود سوچ لو۔

ﷺ یہ اکٹھا جواب ہے کفار مکہ کے ان تمام مضطرب اقوال کا جو وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے کہ یہ شاعری ہے، یہ ساحری ہے، یہ پراگندہ خواب ہیں، یہ من گھڑت افسانے ہیں، وغیرہ۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ اس کتاب میں آخر وہ کونسی نرالی بات ہے جو تمہاری سمجھ میں نہ آتی ہو، جس کی وجہ سے اس کے متعلق تم اتنی متضاد رائیں قائم کر رہے ہو۔ اس میں تو تمہارا اپنا ہی حال بیان کیا گیا ہے۔ تمہارے نفسیات اور تمہارے ہی معاملات زندگی زیر بحث ہیں۔ تمہاری ہی فطرت اور ساخت اور آغاز و انجام پر گفتگو ہے۔ تمہارے ہی ماحول سے وہ نشانیاں جن جن کو ہمیشہ کی گئی ہیں جو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اور تمہارے ہی اخلاقی اوصاف میں سے فضائل اور قبائح کا فرق نمایاں کر کے دکھایا جا رہا ہے جس کے صحیح ہونے پر تمہارے اپنے ضمیر گواہی دیتے ہیں۔ ان سب باتوں میں کیا چیز ایسی گنجلک اور پیچیدہ ہے کہ اس کو سمجھنے سے تمہاری عقل عاجز ہو؟

ﷺ یعنی جب عذاب الہی سر پہ آگیا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ آگئی شامت۔

ﷺ نہایت معنی خیز فقرہ ہے اور اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً: ذرا اچھی طرح اس عذاب کا معائنہ

”ہاٹے ہماری کم نجی، بے شک ہم خطاوار تھے“ اور وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو کھلیاں کر دیا، زندگی کا ایک شرارت تک ان میں نہ رہا۔

ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے۔ مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے۔ اور تمہارے لیے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔

کہو تاکہ کل کوئی اس کی کیفیت پرچھے تو ٹھیک بتا سکو۔ اپنے وہی ٹھاٹھ جاکر پھر مجلس گرم کرو، شاید اب بھی تمہارے عزم و حزم ہاتھ باندھ کر پوچھیں کہ حضور کیا حکم ہے۔ اپنی وہی کونسلیں اور کمیٹیاں بجائے بیٹھے رہو، شاید اب بھی تمہارے عاملانہ مشوروں اور مدبرانہ آراء سے استفادہ کرنے کے لیے دنیا حاضر ہو۔

یہ تبصرہ ہے ان کے اس پسندے نظریہ حیات پر جس کی وجہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر توجہ دکتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ انسان دنیا میں بس یونہی آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو کچھ چاہے کرے اور جس طرح چاہے جیسے۔ کوئی باز پرس اس سے نہیں ہونی ہے۔ کسی کو اسے حساب نہیں دینا ہے۔ چند وز کی بھلی بری زندگی گزار کر سب کو بس یونہی فنا ہو جانا ہے۔ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں بھلائی کی جزا اور برائی کی سزا ہو۔ یہ خیال درحقیقت اس بات کا ہم مسمی تھا کہ کائنات کا یہ سارا نظام محض کسی کھنڈرے کا کھیل ہے جس کا کوئی سنجیدہ مقصد نہیں ہے۔ اور یہی خیالی دعوت پیغمبر سے ان کی بے اعتنائی کا اصل سبب تھا۔

یعنی ہمیں کھینا ہی ہوتا تو کھلونے بنا کر ہم خود ہی کھیل لیتے۔ اس صورت میں ظلم تو ہرگز نہ کیا جاتا کہ خواہ مخواہ ایک ذی حس، ذی شعور، ذمہ دار مخلوق کو پیدا کر ڈالا جاتا۔ اس کے درمیان حق و باطل کی یہ کشمکشیں اور کھینچا تانیاں کرائی جاتیں، اور محض اپنے لطف و تفریح کے لیے ہم دوسروں کو بلاوجہ تکلیفوں میں ڈال دیتے۔ تمہارے خدا نے یہ دنیا کچھ رومی اکھاڑے (COLOSSEUM) کے طور پر نہیں بنائی ہے کہ بندوں کو دزدندوں سے لڑوا کر اور ان کی بوٹیاں پھونکا کر خوشی کے ٹھٹھے لگائے۔

یعنی ہم بازی کر رہے ہیں، نہ ہمارا کام کھیل تماشا کرنا ہے۔ ہماری یہ دنیا ایک سنجیدہ نظام ہے

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے اللہ کا ہے۔ اور جو فرشتے، اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے مترانی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، دم نہیں لیتے۔

جس میں کوئی باطل چیز جم نہیں سکتی۔ باطل یہاں جب بھی سر اٹھاتا ہے، حقیقت سے اس کا تصادم ہو کر رہتا ہے اور آخر کار وہ مٹ کر ہی رہتا ہے۔ اس دنیا کو اگر تم تماشا گاہ سمجھ کر جھوٹے، یا حقیقت کے خلاف باطل نظریات پر کام کر دو گے تو نتیجہ تمہاری اپنی ہی تباہی ہو گا۔ نوع انسانی کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو کہ دنیا کو محض ایک تماشا گاہ، محض ایک خزانہ لٹا، محض ایک عیش کدہ سمجھ کر جینے والی، اور انبیاء کی بتائی ہوئی حقیقت سے منہ موڑ کر باطل نظریات پر کام کرنے والی قومیں پے در پے کس انجام سے دو چار ہوتی رہی ہیں۔ پھر یہ کونسی عقلندی ہے کہ جب سمجھانے والا سمجھاٹے تو اس کا مذاق اڑاؤ، اور جب اپنے ہی کیے کر تو توں کے نتائج عذاب الہی کی صورت میں سر پر آجائیں تو چیخنے لگو کہ ہمارے بے شک ہم خطا وار تھے۔

۱۰۰ یہاں سے توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال پر گفتگو شروع ہوتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان اصل بنائے نزاع تھی۔ اب مشرکین مکہ کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ کائنات کا یہ نظام جس میں تم جی رہے ہو جس کے متعلق ابھی یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ کسی کھلڈرے کا کھلونا نہیں ہے، جس کے متعلق یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ ایک سنجیدہ اور بامقصد اور معنی بر حقیقت نظام ہے، اور جس کے متعلق یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس میں باطل ہمیشہ حقیقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس پورے نظام کا خالق، مالک، حاکم اور رب صرف ایک خدا ہے، اور اس حقیقت کے مقابلے میں باطل یہ ہے کہ اسے بہت سے خداؤں کی مشترک سلطنت سمجھا جائے، یا یہ خیال کیا جائے کہ ایک بڑے خدا کی خدائی میں دوسرے چھوٹے چھوٹے خداؤں کا بھی کچھ دخل ہے۔

۱۰۱ یعنی وہی فرشتے جن کو مشرکین عرب خدا کی اولاد سمجھ کر، یا خدائی میں ذیل مان کر معبود بنائے ہوئے تھے۔ ۱۰۲ یعنی خدا کی بندگی کرنا ان کو ناگوار بھی نہیں ہے کہ بادل ناخواستہ بندگی کرتے کرتے وہ ملول ہو جاتے ہوں۔ اصل میں لفظ لا یتخسرون استعمال کیا گیا ہے۔ استخسار میں تکان کا مبالغہ پایا جاتا ہے اور

کیا ان لوگوں کے بنائے ہوئے یعنی خدا ایسے ہیں کہ بے جان کو جان بخش کر، اٹھا کھڑا کرتے ہوں؟
اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین اور آسمان دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔
اس سے مراد وہ مکان ہے جو کسی ناگوار کام کے کرنے سے لائق ہوتی ہے۔

لئے اصل میں لفظ "ینشرون" استعمال ہوا ہے جو "انتشار" سے مشتق ہے۔ انتشار کے معنی ہیں بے جان پڑی ہوئی چیز کو اٹھا کھڑا کرنا۔ اگرچہ اس لفظ کو قرآن مجید میں بالعموم زندگی بعد موت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، لیکن اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر، اصل لغوی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ بے جان مادے میں زندگی چھونک دینے کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔
اور موقع و محل کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لفظ یہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن مشینوں کو انہوں نے خدا قرار دے رکھا ہے اور اپنا معبود بنایا ہے، کیا ان میں کوئی ایسا ہے جو مادہ غیر ذی حیات میں زندگی پیدا کرتا ہو؟ اگر ایک اللہ کے سوا کسی میں یہ طاقت نہیں ہے۔ اور مشرکین عرب خود مانتے تھے کہ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے۔ تو پھر وہ ان کو خدا اور معبود کس لیے مان رہے ہیں؟

لئے یہ استدلال سادہ بھی ہے اور بہت گہرا بھی۔ سادہ سی بات، جس کو ایک بدوی، ایک دیہاتی، ایک موٹی سی سمجھ کا آدمی بھی باسانی سمجھ سکتا ہے، یہ ہے کہ ایک معمولی گھر کا نظام بھی چار دن غیرت نہیں چل سکتا اگر اس کے دو صاحب خانہ ہوں۔ اور گہری بات یہ ہے کہ کائنات کا پورا نظام، زمین کی تہوں سے لے کر بعید ترین سیاروں تک، ایک ہمہ گیر قانون پر چل رہا ہے۔ یہ ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتا اگر اس کی بے شمار مختلف قوتوں اور بے حد حساب چیزوں کے درمیان تناسب اور توازن اور ہم آہنگی اور تعاون نہ ہو۔ اور یہ سب کچھ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کوئی اٹل اور غالب و قابض ضابطہ ان بے شمار اشیا اور قوتوں کو پوری مناسبت کے ساتھ باہم کام کرتے رہنے پر مجبور کر رہا ہو۔ اب یہ کس طرح تصور کیا جاسکتا ہے کہ بہت سے مطلق العنان فرمانرواؤں کی حکومت میں ایک ضابطہ اس باقاعدگی کے ساتھ چل سکے۔ نظم کا وجود خود ہی ناظم کی وحدت کو مستلزم ہے۔ قانون اور ضابطہ کی ہمہ گیری آپ ہی اس بات پر شاید ہے کہ اختیارات ایک ہی حاکمیت میں مرکوز ہیں اور وہ حاکمیت مختلف حاکموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔

پس پاک ہے اللہ رب العرش اُن باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کے لیے
رکسی کے آگے، جواب دہ نہیں بنے اور سب جواب دہ ہیں۔

کیا اُسے چھوڑ کر انہوں نے دوسرے خدا بنالیے ہیں؟ اے محمد، ان سے کہو کہ لاؤ اپنی
دلیل، یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں
بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ حقیقت
سے بے خبر ہیں اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اُس کے
بھی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم میری ہی بندگی کرو۔

یہ کہتے ہیں رحمن اولاد رکھتا ہے۔ سبحان اللہ، وہ تو بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔
اُس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اُس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ اُن کے سامنے ہے اُسے
بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے ادھل جاتا ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں
کرتے بجز اُس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرے

ﷻ رب العرش، یعنی کائنات کے تخت سلطنت کا مالک۔

ﷻ پہلے دوا استدلال عقلی تھے۔ اور یہ استدلال عقلی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک جتنی کتابیں بھی خدا کی
طرف سے دنیا کے کسی ملک میں کسی قوم کے پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں، ان میں سے کسی میں یہ نکال کر دکھاؤ کہ اللہ
خالق زمین و آسمان کے سوا کوئی دوسرا بھی خدائی کا کوئی شائبہ رکھتا ہے اور کسی اور کو بھی بندگی و عبادت کا حق
پہنچتا ہے۔ پھر یہ کیسا مذہب تم لوگوں نے بنا رکھا ہے جس کی تائید میں نہ عقل سے کوئی دلیل ہے اور نہ آسمانی
کتابیں ہی جس کے لیے کوئی شہادت فراہم کرتی ہیں۔

ﷻ یعنی نبی کی بات پر ان کا توجہ نہ کرنا علم پر نہیں بلکہ جہل پر مبنی ہے۔ حقیقت سے بے خبر ہیں، اس
لیے سمجھانے والے کی بات کو ناقابل التفات سمجھتے ہیں۔

ﷻ یہاں پھر فرشتوں ہی کا ذکر ہے جن کو مشرکین عرب خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ بعد کی تقریر سے یہ
بات خود ظاہر ہو جاتی ہے۔

رہتے ہیں۔ اور جو ان میں سے کوئی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں بھی ایک خدا ہوں تو اسے ہم جہنم کی سزا دیں، ہمارے ہاں ظالموں کا یہی بدلہ ہے یہ

کیا وہ لوگ جہنم نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین یا ہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔

۷۷ مشرکین فرشتوں کو دو وجوہ سے معبود بناتے تھے۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک وہ خدا کی اولاد تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ ان کی پرستش (عمر شام) کر کے انہیں خدا کے ہاں اپنا شفع (سفارش) بنانا چاہتے تھے۔ ویقولون هؤلاء شفعاؤنا عند اللہ (یونس۔ رکوع ۲) اور مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى (الزمر۔ رکوع ۱)۔ ان آیات میں دونوں وجوہ کی تردید کر دی گئی ہے۔

اس جگہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن بالعموم شفاعت کے شرکانہ عقیدے کی تردید کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ جہنم تم شفع قرار دیتے ہو وہ علم غیب نہیں رکھتے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جو ان کے سامنے ہیں اور ان باتوں کو بھی جو ان سے اوجھل ہیں۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ آخر ان کو سفارش کرنے کا مطلق اور غیر مشروط اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ ہر شخص کے اگلے پچھلے اور پوشیدہ و ظاہر حالات سے واقف نہیں ہیں۔ اس لیے خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء و صالحین، ہر ایک کا اختیار شفاعت لازماً اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی کے حق میں شفاعت کی اجازت دے۔ بطور خود ہر کس و نا کس کی شفاعت کر دینے کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے۔ اور جب شفاعت سننا یا نہ سننا اور اسے قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اللہ کی مرضی پر موقوف ہے تو ایسے بے اختیار شفع اس قابل کہہ سکتے ہیں کہ ان کے آگے سرب نیاز جھکایا جائے اور دست سوال دراز کیا جائے۔

۷۸ اصل میں "رتق" اور "فتق" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رتق کے معنی ہیں یکجا ہونا، اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، متصل اور متلاصق ہونا۔ اور فتق کے معنی پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں۔ بظاہر ان الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک توڑے (MASS) کی سی تھی، بعد میں اس کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے زمین اور دوسرے اجرام فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنا دیے گئے۔

کیا وہ در سہاری اس خلّاتی کو نہیں مانتے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ جھا دیئے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے، اور اس میں کشادہ راہیں بنادیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ پھت بنا دیا، مگر یہ ہیں کہ اُس کی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ اور وہ التدریج ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک ملک میں تیر رہے ہیں۔

۱۵۹ اس سے جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ پانی کہ خدا نے سببِ زندگی اور اصل حیات بنایا، اُسی میں اور اُسی سے زندگی کا آغاز کیا۔ دوسری جگہ اس مطلب کو ابن الفاعظ میں بیان کیا گیا ہے، **وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّنْ مَّاءٍ (النور۔ رکوع ۱)** اور خدا نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔

۱۶۰ اس کی تشریح سورہ نحل میں گزر چکی ہے، ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۲۔

۱۶۱ یعنی پہاڑوں کے درمیان ایسے درے رکھ دیے اور دریا نکال دیے جن کی وجہ سے پہاڑی علاقوں سے گزرنے اور زمین کے ایک خطے سے دوسرے خطے کی طرف عبور کرنے کے راستے نکل آتے ہیں۔ اسی طرح زمین کے دوسرے حصوں کی ساخت بھی ایسی رکھی ہے کہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچنے کے لیے راہ بن جاتی ہے یا بنالی جاسکتی ہے۔

۱۶۲ ذومعنی فقرہ ہے۔ یہ مطلب بھی ہے کہ لوگ زمین میں چلنے کے لیے راہ پائیں، اور یہ بھی کہ وہ اس حکمت اور اس کاریگری اور اس انتظام کو دیکھ کر حقیقت تک پہنچنے کا راستہ پالیں۔

۱۶۳ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ الحجّ، حواشی نمبر ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۲۔

۱۶۴ یعنی اُن نشانیوں کی طرف جو آسمان میں ہیں۔

۱۶۵ کُلّ اور لیسبتھون کے الفاظ بتاتے ہیں کہ مراد صرف سورج اور چاند ہی نہیں ہیں بلکہ دوسرے اجرامِ فلکی، یعنی تارے بھی مراد ہیں، ورنہ جمع کے بجائے تشبیہ کا صیغہ استعمال کیا جاتا۔ فلک جو فارسی کے چرخ اور گروں کا ٹھیک ہم معنی ہے، عربی زبان میں آسمان کے معروف ناموں میں سے ہے۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔ دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سب تارے ایک ہی فلک میں نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کا فلک الگ ہے۔ دوسرے یہ کہ فلک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں یہ تارے کھوٹیوں کی طرح بٹڑے ہوئے

اور اُسے محمدؐ، ہمیشگیِ توہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لیے نہیں رکھی ہے، اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے؟ ہر جاندار کو موت کا فرہ چکھنا ہے، اور ہم اچھے اور بُرے ہوں اور وہ خود انہیں لیے ہوئے گھوم رہا ہو بلکہ وہ کوئی سیال شے ہے یا فضا اور خلا کی سی نوعیت کی چیز ہے جس میں ان تاروں کی حرکت تیرنے کے فعل سے مشابہت رکھتی ہے۔

قدیم زمانے میں لوگوں کے لیے آسمان وزمین کے رتق وفتق، اور پانی سے ہر زندہ چیز کے پیدا کیے جانے، اور تاروں کے ایک ایک فلک میں تیرنے کا مفہوم کچھ اور تھا، موجودہ زمانے میں طبیعیات (PHYSICS) حیاتیات، (BIOLOGY) اور علمِ سمیّت (ASTRONOMY) کی جدید معلومات نے ہمارے لیے ان کا مفہوم کچھ اور کر دیا ہے، اور نہیں کہہ سکتے کہ آگے چل کر انسان کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ان الفاظ کے کن معانی پر روشنی ڈالیں گی۔ بہر حال موجودہ زمانے کا انسان ان تینوں آیات کو بالکل اپنی جو بہترین معلومات کے مطابق پاتا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ وَلَوْ أَنَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِنْ كَذَّابٍ نَجْزِي الظَّالِمِينَ تک کی تفسیرِ شرک کی تردید میں ہے، اور اُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا سے لے کر فِي نَدَبٍ یَسْبِخُونَ تک جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں توحید کے لیے اِجْبالی (POSITIVE) دلائل دیئے گئے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ یہ نظام کائنات جو تمہارے سامنے ہے، کیا اس میں کہیں ایک اللہ رب العالمین کے سوا کسی اور کی بھی کوئی کاریگری تمہیں نظر آتی ہے؟ کیا یہ نظام ایک سے زیادہ خداؤں کی کار فرمائی میں بن سکتا تھا اور اس بامعادگی کے ساتھ جاری رہ سکتا تھا؟ کیا اس حکیمانہ نظام کے متعلق کوئی صاحبِ عقل و خرد آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ ایک کلنڈرے کا کھیل ہے اور اس نے محض تفریح کے لیے چند گڑیاں بنائی ہیں جن سے کچھ مدت کھیل کہ بس وہ بونہی ان کو خاک میں ملا دے گا؟ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور پھر بھی نبی کی بات مانتے ہو؟ انکار کیسے جاتے ہو؟ تم کو نظر نہیں آتا کہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز اُس نظریہ توحید کی شہادت دے رہی ہے جو یہ نبی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے؟

لے یہاں سے پھر سدا تفسیر اس کشمکش کی طرف مڑتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخالفین کے درمیان برپا تھی

حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔ آخر کار تمہیں بیماری ہی طرف پلٹنا ہے۔ یہ منکرین حق جب تمہیں دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق بنالینے ہیں۔ کہتے ہیں: کیا یہ ہے وہ شخص جو تمہارے خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے؟ اور ان کا اپنا حال یہ ہے کہ رحمان کے ذکر سے منکر ہیں۔

۳۷ یہ مختصر جواب ہے اُن ساری دھکیوں اور بدوعلوں اور کوسندوں اور قتل کی سازشوں کا جن سے ہر وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نراضی کی جاتی تھی۔ ایک طرف اکابر قریش تھے جو آئے دن آپ کو اس تبلیغ کے خوفناک نتائج کی دھکیاں دیتے رہتے تھے، اور ان میں سے بعض پر جوش مخالفین بیٹھ بیٹھ کر یہ تک سوچا کرتے تھے کہ کسی طرح آپ کا کام تمام کر دیں۔ دوسری طرف ہر وہ گھر جس کا کوئی فرد اسلام قبول کر لیتا تھا، آپ کا دشمن بن جاتا تھا۔ اُس کی عورتیں آپ کو کلپ کلپ کوستی اور بدو عایش دیتی تھیں اور اُس کے مرد آپ کو ڈراوے دیتے پھرتے تھے۔ خصوصاً ہجرت حبشہ کے بعد تو کتے بھر کے گھروں میں کہرام مچ گیا تھا، کیونکہ مشکل ہی سے کوئی ایسا گھر بنا بچا رہ گیا تھا جس کے کسی لڑکے یا لڑکی نے ہجرت نہ کی ہو۔ یہ سب لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی دُہائیاں دیتے تھے کہ اس شخص نے ہمارے گھر برباد کیے ہیں۔ انہی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے، اور ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تلقین کی گئی ہے کہ تم ان کی پروا کیے بغیر، بے خوف اپنا کام کیسے جاؤ۔

۳۸ یعنی راحت اور رنج، مغلسی اور امیری، غلبہ اور مغلوبی، قوت اور ضعف، صحت اور بیماری، غرض تمام مختلف حالات میں تم لوگوں کی آزمائش کی جا رہی ہے، تاکہ دیکھیں تم اچھے حالات میں متکبر، ظالم، خدا فراموش، بندہ نفس تو نہیں بن جاتے، اور بُرے حالات میں کم سمی کے ساتھ پست اور ذلیل طریقے اور ناجائز راستے تو اختیار نہیں کرنے لگتے۔ لہذا کسی صاحب عقل آدمی کو ان مختلف حالات کے سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے جو حالت بھی اسے پیش آئے، اُس کے امتحانی اور آزمائشی پہلو کو نگاہ میں رکھنا چاہیے اور اس سے بخلیت گزرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ صرف ایک احمق اور کم ظرف آدمی کا کام ہے کہ جب اچھے حالات آئیں تو فرعون بن جائے، اور جب بُرے حالات پیش آجائیں تو زمین پر ناک رگڑنے لگے۔

۳۹ یعنی برائی کے ساتھ اُن کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ یہ فقرہ اُن کے مذاق کا مضون نہیں بتا رہا ہے، بلکہ مذاق اڑانے کی وجہ اور بنیاد پر روشنی ڈال رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فقرہ بجائے خود کوئی

انسان جلد باز مخلوق ہے۔ ابھی میں تم کو اپنی نشانیاں دکھائے دیتا ہوں، جلدی نہ مچاؤ۔^{۱۵۴} یہ لوگ کہتے ہیں ”آخر یہ دھمکی پوری کب ہوگی اگر تم سچے ہو؟“ کاش ان کافروں کو اُس وقت کا کچھ علم ہوتا جبکہ یہ نہ اپنے منہ آگ سے بچا سکیں گے نہ اپنی پیٹھیں، اور نہ کہیں سے ان کو مدد پہنچے گی۔ وہ بلا اچانک آئے گی اور انہیں اس طرح یک لخت دبوچ لے گی کہ یہ نہ اُس کو دفع کر سکیں گے اور مذاق کا فقرہ نہیں ہے۔ مذاق تو وہ دوسرے ہی الفاظ میں اڑاتے ہونگے اور کچھ اور ہی طرح کے آوازے کتے اور فقرے سمیت کرتے ہونگے۔ البتہ یہ سارا دل کا بخار جس وجہ سے نکالا جاتا تھا وہ یہ تھی کہ آپ ان کے خود ساختہ معبودوں کی خدائی کا رد کرتے تھے۔

۱۵۵ یعنی بتوں اور بناوٹی خداؤں کی مخالفت تو انہیں اس قدر ناگوار ہے کہ اُس کا بدلہ لینے کے لیے تمہاری تشبیہ و تذلیل کرتے ہیں، مگر انہیں خود اپنے حال پر شرم نہیں آتی کہ خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور اس کا ذکر سن کر آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔

۱۵۶ اصل میں خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَجَلَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا افعلی ترجمہ ہے ”انسان جلد باز“ سے بنایا گیا، یا پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن یہ نفعلی معنی اصل مقصود کلام نہیں ہیں۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص عقل کا پتلا ہے، اور فلاں شخص حرفوں کا بنا ہوا ہے، اُسی طرح عربی زبان میں کہتے ہیں کہ وہ فلاں چیز سے پیدا کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز اُس کی سرشت میں ہے۔ یہی بات جس کو یہاں خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَجَلٍ کہہ کر ادا کیا گیا ہے، دوسری جگہ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا، ”انسان جلد باز واقع ہوا ہے“ دینی اسرائیل، رکوع ۲۷ کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

۱۵۷ بعد کی تقریر صاف بتا رہی ہے کہ یہاں ”نشانیں“ سے کیا مراد ہے۔ وہ لوگ جن باتوں کا مذاق اڑاتے تھے اُن میں سے ایک عذاب الہی، اور قیامت اور جہنم کا مضمون بھی تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص آئے دن میں ڈراوے دیتا ہے کہ میرا انکار کرو گے تو خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا، اور قیامت میں تم پر یہ بنے گی اور تم لوگ یوں جہنم کے اندھن بنائے جاؤ گے۔ مگر ہم روزا انکار کرتے ہیں اور دندناتے پھر رہے ہیں۔ نہ کوئی عذاب آتا دکھائی دے رہا ہے اور نہ کوئی قیامت ہی ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ اسی کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

ان کو لمحہ بھر مہلت ہی مل سکے گی۔ مذاق تم سے پہلے بھی رسولوں کا اڑایا جا چکا ہے، مگر ان کا مذاق اڑانے والے اُسی چیز کے پھیر میں آکر رہے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے یا

اُسے محمدؐ، ان سے کہو، کون ہے جو رات کو یادن کو تمہیں رحمان سے بچا سکتا ہو؟ مگر یہ اپنے رب کی نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں۔ کیا یہ کچھ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلے میں ان کی حمایت کریں؟ وہ تو نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری ہی تائید ان کو حاصل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد کو ہم زندگی کا سرد سامان دیئے چلے گئے یہاں تک کہ ان کو دن لگ گئے۔ مگر کیا انہیں نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو مختلف سمتوں سے کھٹاتے چلے آ رہے ہیں؟ پھر کیا یہ غالب آجائیں گے؟ ان سے کہہ دو کہ میں تو وحی کی بنا پر تمہیں متنبہ کر رہا

۴۳ یعنی اگر اچانک دن کو یارات کو کسی وقت خدا کا زبردست ہاتھ تم پر پڑ جائے تو آخر وہ کونسا زور آور حامی و ناصر ہے جو اس کی پکڑ سے تم کو بچالے گا؟

۴۴ یعنی ہماری اس مہربانی اور پرورش سے یہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کا کوئی ذاتی اشتقاق ہے جس کا چھیننے والا کوئی نہیں۔ اپنی خوشحالیوں اور سرداریوں کو یہ لازوال سمجھنے لگے ہیں اور ایسے سرمست ہو گئے ہیں کہ انہیں کبھی یہ خیال تک نہیں آتا کہ لوہ پر کوئی خدا بھی ہے جو ان کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔

۴۵ یہ مضمون اس سے پہلے سورہ رعد میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح بھی کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۴۶۵-۴۶۶)۔ یہاں اس سیاق و سباق میں یہ ایک اور معنی بھی دے رہا ہے۔ وہ یہ کہ زمین میں ہر طرف ایک غالب طافت کی کار فرمائی کے یہ آثار نظر آتے ہیں کہ اچانک کبھی ٹھٹھکی شکل میں، کبھی وبا کی شکل میں، کبھی سیلاب کی شکل میں، کبھی زلزلے کی شکل میں، کبھی سردی یا گرمی کی شکل میں، اور کبھی کسی شکل میں، اور کبھی کسی اور شکل میں کوئی بلا ایسی آجاتی ہے جو انسان کے سب کیسے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی مرجھاتے ہیں۔ بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ پہاڑاتی کھیتیاں غارت ہو جاتی ہیں۔ پیداوار گھٹ جاتی ہے۔ تجارتوں میں کساد بازاری آنے لگتی ہے۔ غرض انسان کے وسائل زندگی میں کبھی کسی طرف سے کمی

ہوں۔ مگر ہرے پکار کو نہیں سنا کرتے جبکہ انہیں خبردار کیا جائے۔ اور اگر تیرے رب کا عذاب ذرا سا انہیں چھو جائے تو اچھی پیچ اٹھیں کہ ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطاوار تھے۔
قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کارائی کے واسطے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہو گا وہ ہم سامنے لے آئیں گے۔ اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں۔

پہلے ہم موسیٰ اور ہارون کو فرقان اور روشنی اور ذکر عطا کر چکے ہیں ان متقی لوگوں کی بھلائی

واقع ہو جاتی ہے اور کبھی کسی طرف سے۔ اور انسان اپنا سارا زور لگا کر بھی ان نقصانات کو نہیں روک سکتا۔
۹۔ یعنی جبکہ ان کے تمام وسائل زندگی ہمارے ہاتھ میں ہیں، جس چیز کو چاہیں گھٹا دیں اور جسے چاہیں بڑھائیں، تو کیا یہ اتنا بل بوتہ رکھتے ہیں کہ ہمارے مقابلے میں غالب آجائیں اور ہماری پکڑ سے بچ نکلیں؟ کیا یہ آثار ان کو یہی اطمینان دلا دے ہیں کہ تمہاری طاقت لازوال اور تمہارا عیش غیر فانی ہے اور کوئی تمہیں پکڑنے والا نہیں ہے؟
۱۰۔ وہی عذاب جس کے لیے یہ جلدی مچاتے ہیں اور مذاق کے انداز میں کہتے ہیں کہ لاؤ نا وہ عذاب، کیوں نہیں وہ ٹوٹ پڑتا۔

۱۱۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۹۔ ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس ترازو کی نوعیت کیا ہوگی۔ بہر حال وہ کوئی ایسی چیز ہوگی جو مادی چیزوں کو تولنے کے بجائے انسان کے اخلاقی اوصاف و اعمال اور اس کی نیکی و بدی کو تولے گی اور ٹھیک ٹھیک وزن کر کے بتا دیگی کہ اخلاقی حیثیت سے کس شخص کا کیا پایہ ہے۔ نیک ہے تو کتنا نیک ہے اور بد ہے تو کتنا بد۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ہماری زبان کے دوسرے الفاظ کو چھوڑ کر ترازو کا لفظ یا تو اس وجہ سے انتخاب فرمایا ہے کہ اس کی نوعیت ترازو سے مشابہ ہوگی، یا اس انتخاب کا مقصد یہ تصور دلانا ہے کہ جس طرح ایک ترازو کے پلڑے دو چیزوں کے وزن کا فرق ٹھیک ٹھیک بتا دیتے ہیں، اسی طرح ہماری میزان عدل بھی ہر انسان کے کارنامہ زندگی کو چانچ کر یہ کم و کاست بتا دے گی کہ اس میں نیکی کا پہلو غالب ہے یا بدی کا۔

۱۲۔ یہاں سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر شروع ہوتا ہے اور پے درپے بہت سے انبیاء کی زندگی کے احوال

کے لیے جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈریں اور جن کو (حساب کی) اس گھڑی کا کھٹکا لگا ہوا ہو۔ اور اب یہ بابرکت ذکر ”ہم نے تمہارے لیے“ نازل کیا ہے۔ پھر کیا تم اس کو قبول کرنے سے انکاری ہو گے اُس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اُس کو خوب جانتے تھے۔

کی طرف مفصل یا مختصر اشارے کیے جاتے ہیں۔ یہ ذکر جس سیاق و سباق میں آیا ہے اُس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حسب ذیل باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں:-

اول یہ کہ تمام پچھلے انبیاء بھی بشر ہی تھے، کوئی نرالی مخلوق نہ تھے۔ تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ آج پہلی مرتبہ ہی پیش نہیں آیا ہے کہ ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔

دوم یہ کہ پہلے انبیاء بھی اسی کام کے لیے آئے تھے جو کام اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں۔ یہی اُن کا مشن تھا اور یہی ان کی تعلیم تھی۔

سوم یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ رہا ہے۔ بڑے بڑے مصائب سے وہ گزرے ہیں، سالہا سال مصائب میں مبتلا رہے ہیں، شخصی اور ذاتی مصائب میں بھی اور اپنے مخالفوں کے ڈاے ہوئے مصائب میں بھی، مگر آخر کار اللہ کی نصرت و تائید اُن کو حاصل ہوئی ہے، اس نے اپنے فضل و رحمت سے اُن کو نوازا ہے، ان کی دعاؤں کو قبول کیا ہے، ان کی تکلیفوں کو رفع کیا ہے، ان کے مخالفوں کو نیچا دکھایا ہے، اور معجزانہ طریقوں پر ان کی مدد کی ہے۔

چہاں یہ کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقبول بارگاہ ہونے کے باوجود، اور اس کی طرف سے بڑی بڑی حیرت انگیز حادثاتیں پانے کے باوجود تھے وہ بندے اور بشر ہی۔ الوہیت ان میں سے کسی کو حاصل نہ تھی۔ رائے اور قبیلے کی غلطی بھی کرتے تھے۔ بیمار بھی ہوتے تھے۔ آزمائشوں میں بھی ڈالے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ قصور بھی ان سے ہو جاتے تھے اور انہیں سزا تک دے دی جاتی تھی۔

۵۔ تینوں الفاظ توراۃ کی تعریف میں استعمال ہوئے ہیں، یعنی وہ حق و باطل کا فرق دکھانے والی کسوٹی تھی، وہ انسان کو زندگی کا سیدھا راستہ دکھانے والی روشنی تھی، اور وہ ادلاؤ آدم کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے والی نصیحت تھی۔

یاد کرو وہ موقع جبکہ اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”یہ مورتیں کسی ہیں جن کے تم لوگ اللہ یعنی اگرچہ بھی گئی تھی وہ تمام انسانوں کے لیے، مگر اس سے فائدہ عملاً وہی لوگ اٹھا سکتے تھے جو ان صفات سے منصف ہوں۔“

۲۷ جس کا الہی اوپر ذکر گزرا ہے، یعنی قیامت۔

۲۸ ”ہوشمندی“ ہم نے ”رشد“ کا ترجمہ کیا ہے جس کے معنی ہیں ”صحیح و غلط میں تمیز کر کے صحیح بات یا طریقے کو اختیار کرنا اور غلط بات یا طریقے سے احتراز کرنا“ اس مفہوم کے لحاظ سے ”رشد“ کا ترجمہ ”راست روی“ بھی ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ ”رشد“ کا لفظ محض راست روی کو نہیں بلکہ اُس راست روی کو ظاہر کرتا ہے جو نتیجہ ہونے پر صحیح اور عقل سلیم کا، اس لیے ہم نے ”ہوشمندی“ کے لفظ کو اُس کے مفہوم سے اقرب سمجھا ہے۔

”ابراہیم کو اس کی ہوشمندی بخشی“ یعنی جو ہوشمندی اس کو حاصل تھی وہ ہماری عطا کردہ تھی۔

”ہم اس کو خوب جانتے تھے“ یعنی ہماری یہ بخشش کوئی اندھی بانٹ نہ تھی۔ یہیں معلوم تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے، اس لیے ہم نے اس کو نوازا۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَقِیْقَتُہٗ یَجْعَلُ رِیْسًا لِّلنَّاسِ، ”اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کے حوالے کرے“ (الانعام، رکوع ۱۵)۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے سردارانِ قریش کے اُس اعتراض کی طرف جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آخر اس شخص میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ اللہ ہم کو چھوڑ کر اسے رسالت کے منصب پر مقرر کرے۔ اس کا جواب مختلف مقامات پر قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے دیا گیا ہے۔ یہاں صرف اتنے لطیف اشارے پر اکتفا کیا گیا کہ یہی سوال ابراہیم کے متعلق بھی ہو سکتا تھا، پوچھا جاسکتا تھا کہ سارے ملک عراق میں ایک ابراہیم ہی کیوں اس نعمت سے نوازا گیا، مگر ہم جانتے تھے کہ ابراہیم میں کیا اہمیت ہے، اس لیے اُن کی پوری قوم میں سے اُن کو اس نعمت کے لیے منتخب کیا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت پاک کے مختلف پہلو اس سے پہلے سورہ بقرہ، انعام، توبہ، ہود، ابراہیم، حجر اور غل میں گزر چکے ہیں جن پر ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۸۰ تا ۱۱۴ - ۱۹۶ تا ۱۹۹)۔

۲۰۱-۵۵۲ تا ۵۶۰ - جلد دوم، صفحہ ۲۲۲-۲۵۳ تا ۲۵۶ - ۲۸۸ تا ۲۹۱ - ۵۰۹ تا ۵۱۱ - ۵۸۰

۲۹ جس واقعہ کا آگے ذکر کیا جا رہا ہے اُس کو پڑھنے سے پہلے یہ بات اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ قریش

گرویدہ ہو رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ”ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔ اس نے کہا ”تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا ”کیا تمہارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے؟“ اُس نے جواب دیا ”نہیں، بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب اور اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔ اور خدا کی قسم میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا۔“ چنانچہ اُس نے اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف اُن کے بڑے بت کو

کے لوگ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے، کعبہ انہی کا تعمیر کردہ تھا، سارے عرب میں کعبے کی مرکزیت انہی کی نسبت کے سبب سے تھی اور قریش کا سارا بھرم اسی لیے بندھا ہوا تھا کہ یہ اولاد ابراہیم ہیں اور کعبہ ابراہیمی کے مجاور ہیں۔ آج اس زمانے اور عرب سے دور دراز کے ماحول میں تو حضرت ابراہیم کا یہ قصہ صرف ایک سبق آموز تاریخی قصہ ہی نظر آتا ہے، مگر جس زمانے اور ماحول میں اول اول یہ بیان کیا گیا تھا، اس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے تو محسوس ہو گا کہ قریش کے مذہب اور ان کی برہمنیت پر یہ ایک ایسی کاری ضرب تھی جو ٹھیک اُس کی جڑ پر جا کر لگتی تھی۔ ۱۵۷ اس فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہو گا کہ ”کیا تمہارے سامنے حق پیش کر رہا ہے یا کھبتا ہے۔“ لیکن اصل مفہوم وہی ہے جس کی ترجمانی اوپر کی گئی ہے۔ اُن لوگوں کو اپنے دین کے برحق ہونے کا اتنا یقین تھا کہ وہ یہ تصور کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ یہ باتیں کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ تم مذاق اور کھیل کر رہے ہو یا واقعی تمہارے یہی خیالات ہیں۔

۱۵۸ یعنی اگر تم استدلال سے بات نہیں سمجھتے ہو تو میں عملاً تمہیں مشاہدہ کرادوں گا کہ یہ بے بس ہیں، ان کے پاس کچھ بھی اختیارات نہیں ہیں، اور ان کو خدا بنانا غلط ہے۔ رہی یہ بات کہ عملی تجربے اور مشاہدے سے یہ بات وہ کس طرح ثابت کریں گے، تو اس کی کوئی تفصیل حضرت ابراہیم نے اُس موقع پر نہیں بتائی۔

۱۵۹ یعنی موقع پا کر جبکہ پجاری اور مجاور موجود نہ تھے، حضرت ابراہیم ان کے مرکزی بت خاتمے میں لگس گئے اور سارے بتوں کو توڑ ڈالا۔

چھوڑ دیا تاکہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ انہوں نے آکر بتوں کا یہ حال دیکھا تو کہنے لگے یہ ہمارے خداؤں کا حال کس نے کر دیا؟ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ۔ بعض لوگ ابوے "ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیم ہے۔" انہوں نے کہا "تو پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے تاکہ لوگ دیکھ لیں اس کی کیسی خبر لی جاتی ہے؟" ابراہیم کے آنے پر، انہوں نے پوچھا "کیوں ابراہیم، تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟" اس نے جواب دیا "بلکہ یہ سب کچھ ان کے سردار نے کیا ہے، ان ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں۔" یہ سن کر وہ لوگ اپنے ضمیر کی طرف

۵۸ "اس کی طرف" کا اشارہ بڑے بُت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور خود حضرت ابراہیم کی طرف بھی۔ اگر پہلی بات ہو تو یہ حضرت ابراہیم کی طرف سے اُن کے عقائد پر ایک طنز کا ہم معنی ہے یعنی اگر ان کے نزدیک واقعی یہ خدا ہیں تو انہیں اپنے بڑے خدا کے متعلق یہ شبہ ہونا چاہیے کہ شاید بڑے حضرت ان چھوٹے حضروں سے کسی بات پر بگڑ گئے ہوں اور سب کا کچھ مرنبا ڈالا ہو۔ اور اگر دوسرا مفہوم مراد لیا جائے تو حضرت ابراہیم کا منشا اس کارروائی سے یہ تھا کہ اپنے بتوں کا یہ حال دیکھ کر شاید ان کا ذہن میری ہی طرف منتقل ہو گا اور یہ مجھ سے پوچھیں گے تو مجھ کو پھر ان سے صاف صاف بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔

۵۹ یہ گویا حضرت ابراہیم کی منہ مانگی مراد تھی، کیونکہ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ بات صرف پر دستوں اور پجاریوں ہی کے سامنے نہ ہو بلکہ عام لوگ بھی موجود ہوں اور سب دیکھ لیں کہ یہ بت جو اُن کے قاضی الحاجات بنا کر رکھے گئے ہیں کیسے بے بس ہیں اور خود یہ پر دست حضرات ان کو کیا سمجھتے ہیں۔ اس طرح ان پجاریوں سے بھی وہی حماقت سرزد ہوئی جو فرعون سے سرزد ہوئی تھی۔ اُس نے بھی جادو گروں سے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک بھر کی خلقت جمع کرائی تھی اور انہوں نے بھی حضرت ابراہیم کا مقدمہ سننے کے لیے عوام کو اکٹھا کر لیا۔ وہاں حضرت موسیٰ کو سب کے سامنے یہ ثابت کرنے کا موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ لائے ہیں وہ جادو نہیں معجزہ ہے۔ اور یہاں حضرت ابراہیم کو ان کے دشمنوں نے آپ ہی یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ عوام کے سامنے اُن کے مکر و فریب کا طلسم توڑ دیں۔

۶۰ یہ آخری فقرہ خود ظاہر کر رہا ہے کہ پہلے فقرے میں حضرت ابراہیم نے بُت شکنی کے اس فعل کو بڑے

بت کی طرف جو منسوب کیا ہے اس سے ان کا مقصد جھوٹ بولنا نہ تھا، بلکہ وہ اپنے مخالفین پر محبت قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات انہوں نے اس لیے کہی تھی کہ وہ لوگ جواب میں خود اس کا اقرار کریں کہ ان کے یہ معبود بالکل بے بس ہیں اور ان سے کسی فعل کی توقع تک نہیں کی جاسکتی ہے۔ ایسے مواقع پر ایک شخص استدلال کی خاطر جو خلاف واقعہ بات کہتا ہے اُس کو جھوٹ قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ نہ وہ خود جھوٹ کی نیت سے ایسی بات کہتا ہے اور نہ اس کے مخاطب ہی اسے جھوٹ سمجھتے ہیں۔ کہنے والا اسے محبت قائم کرنے کے لیے کہتا ہے اور سننے والا بھی اُسے اسی معنی میں لیتا ہے۔

بدقسمتی سے حدیث کی ایک روایت میں یہ بات آگئی ہے کہ حضرت ابراہیم اپنی زندگی میں تین مرتبہ جھوٹ بولے ہیں۔ ان میں سے ایک جھوٹ ”تو یہ ہے، اور دوسرا جھوٹ“ سورہ صافات میں حضرت ابراہیم کا قول ”اِنِّی سَقِیْمٌ“ ہے، اور تیسرا جھوٹ ”اُن کا اپنی بیوی کو بہن کہنا ہے جس کا ذکر قرآن میں نہیں بلکہ بائبل کی کتاب پیدائش میں آیا ہے۔ ایک گروہ روایت پرستی میں غلو کر کے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے بخاری و مسلم کے چند راویوں کی صداقت زیادہ عزیز ہے اور اس بات کی پروا نہیں ہے کہ اس سے ایک نبی پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ اس ایک روایت کو لے کر پورے ذخیرہ حدیث پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ساری ہی حدیثوں کو اٹھا کر بھینک دو کیونکہ ان میں ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ نہ ایک یا چند روایات میں کسی خرابی کے پائے جانے سے یہ لازم آتا ہے کہ ساری ہی روایات ناقابل اعتماد ہوں۔ اور نہ جن حدیث کے نقطہ نظر سے کسی روایت کی سند کا مضبوط ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کا متن خواہ کتنا ہی قابل اعتراض ہو مگر اسے ضرور آنکھیں بند کر کے مان لیا جائے۔ سند کے قوی اور قابل اعتماد ہونے کے باوجود بہت سے اسباب ایسے ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے ایک متن غلط صورت میں نقل ہو جاتا ہے اور ایسے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے جن کی قباحت خود پکار رہی ہوتی ہے کہ یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے سند کے ساتھ متن کو دیکھنا بھی ضروری ہے، اور اگر متن میں واقعی کوئی قباحت ہو تو پھر خواہ مخواہ اس کی صحت پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ حدیث، جس میں حضرت ابراہیم کے تین ”جھوٹ“ بیان کیے گئے ہیں، صرف اسی وجہ سے قابل اعتراض

پٹے اور اپنے دلوں میں، کہنے لگے "واقعی تم خود ہی ظالم ہو" مگر پھر اُن کی مت پٹ گئی اور بولے نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کو جھوٹا قرار دے رہی ہے۔ بلکہ اس بنا پر بھی غلط ہے کہ اس میں جن تین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تینوں ہی محل نظر ہیں۔ اُن میں سے ایک "جھوٹ" کا حال بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ کوئی معمولی عقل و خود کا آدمی بھی اس سیاق و سباق میں حضرت ابراہیم کے اس قول پر لفظ "جھوٹ" کا اطلاق نہیں کر سکتا، کجا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معاذ اللہ اس سخن ناشناسی کی توقع کریں۔ رہا اِنی سَفِیْہُم والا واقعہ تو اس کا جھوٹ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت ابراہیم فی الواقع اُس وقت بالکل صحیح و تندرست تھے اور کوئی ادنیٰ سی شکایت بھی اُن کو نہ تھی۔ یہ بات نہ قرآن میں کہیں بیان ہوئی ہے اور نہ اس زیر بحث روایت کے سوا کسی دوسری معتبر روایت میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اب رہ جاتا ہے بیوی کو بہن قرار دینے کا واقعہ، تو وہ بجائے خود ایسا مہمل ہے کہ ایک شخص اس کو سنتے ہی یہ کہہ دے گا کہ یہ ہرگز واقعہ نہیں ہو سکتا۔ قصہ اُس وقت کا بتایا جاتا ہے جب حضرت ابراہیم اپنی بیوی حضرت سارہ کے ساتھ مصر گئے ہیں۔ بائبل کی رو سے اُس وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۷۵ اور حضرت سارہ کی عمر ۶۵ برس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اور اس عمر میں حضرت ابراہیم کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ شاہ مصر اس خوبصورت خاتون کو حاصل کرنے کی خاطر مجھے قتل کر دے گا۔ چنانچہ وہ بیوی سے کہتے ہیں کہ حیب مصری تمہیں پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جانے لگیں تو تم بھی مجھے اپنا بھائی بتانا ادب نہیں بھی تمہیں اپنی بہن بتاؤ لگتا کہ میری جان تو بچ جائے دیہانش، باب ۱۲۔ حدیث کی زیر بحث روایت میں تیسرے "جھوٹ" کی بنیاد اسی صریح لغو اور مہمل اسرائیلی روایت پر ہے۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ جس حدیث کا متن ایسی باتوں پر مشتمل ہو اس کو بھی ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے پر صرف اس لیے اصرار کریں کہ اس کی سند مجروح نہیں ہے؟ اسی طرح کی افراط پسندیاں پھر معاملے کو بگاڑ کر اُس تفریط تک نہایت پہنچا دیتی ہیں جس کا مظاہرہ منکرین حدیث کر رہے ہیں۔

۱۔ اصل میں نَكِسُوا عَلٰی رُؤُسِهِمْ رَاۡنِدًا دِیئے گئے اپنے سروں کے بل، فرمایا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ انہوں نے خجالت کے مارے سر جھکالیے۔ لیکن موقع و محل اور اسلوب بیان اس معنی کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ صحیح مطلب، جو سلسلہ کلام اور انداز کلام پر نظر کرنے سے صاف سمجھ میں

”تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں“ ابراہیم نے کہا ”پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تفس بے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟“ انہوں نے کہا ”جلاؤ الواس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے“ ہم نے کہا ”اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر“ وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام کر دیا۔

آ جاتا ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا جواب سنتے ہی پیٹے تو انہوں نے اپنے دلوں میں سوچا کہ واقعی ظالم تو ہم خود ہو، کیسے بے بس اور بے اختیار معبودوں کو خدا بنائے بیٹھے ہو جو اپنی زبان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان پر کیا مبنی ہو کون انہیں مار گسیا؟ آخر یہ ہماری کیا مدد کریں گے جب کہ خود اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتے۔ لیکن اس کے بعد وہ ان ہی ان پر خدا اور جہالت سوار ہو گئی اور جیسا کہ خدا کا خاصہ ہے، اس کے سوار ہوتے ہی ان کی عقل اوندھ گئی۔ داغ سیدھا سوچتے سوچتے بکا یک اٹا سوچنے لگا۔

الفاظ صاف بتا رہے ہیں، اور سیاق و سباق بھی اس مفہوم کی تائید کر رہا ہے، کہ انہوں نے واقعی اپنے اس فیصلے پر عمل کیا، اور جب آگ کا الاؤ تیار کر کے انہوں نے حضرت ابراہیم کو اس میں پھینکا تب اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیم کے بیسے ٹھنڈی ہو جائے اور بے حذر بن کر رہ جائے۔ پس صریح طور پر یہ بھی ان معجزات میں سے ایک ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان معجزات کی اس بے تاویلیں کرتا ہے کہ اُس کے نزدیک خدا کے لیے بھی نظام عالم کے معمول (ROUTINE) سے ہٹ کر کوئی غیر معمولی کام کرنا ممکن نہیں ہے، تو آخر وہ خدا کو ماننے ہی کی زحمت کیوں اٹھاتا ہے۔ اور اگر اس طرح کی تاویلیں وہ اس لیے کرتا ہے کہ جدید زمانے کے نام نہاد عقلیت پرست ایسی باتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ بعد خدا، تیرے اوپر یہ فرض کس نے عائد کیا تھا کہ تو کسی نہ کسی طرح انہیں منوا کر ہی چھوڑ؟ جو شخص قرآن کو، جیسا کہ وہ ہے، ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اسے منوانے کی خاطر قرآن کو اس کے خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا، جبکہ قرآن کے الفاظ قدم قدم پر اس ڈھلائی کی مزاحمت کر رہے ہوں، آخر کس قسم کی تبلیغ ہے اور کون معقول آدمی اسے جائز سمجھ سکتا ہے۔

اور ہم اُسے اور لوط کو بچا کر اُس سرزمین کی طرف نکال دے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔ اور ہم نے اُسے اسحق عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید، اور سب کو صالح بنایا۔ اور ہم نے ان کو امام بنادیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔ اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعہ نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی، اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

۶۳ بائبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم کے دو بھائی تھے، نحر اور حاران۔ حضرت لوط حاران کے بیٹے تھے (پیدائش باب ۱۱، آیت ۲۶)۔ سورہ عنکبوت میں حضرت ابراہیم کا جو تذکرہ آیا ہے اُس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی قوم میں سے صرف ایک حضرت لوط ہی ان پر ایمان لائے تھے (ملاحظہ ہو رکوع ۱۲)۔ یعنی شام و فلسطین کی سرزمین۔ اس کی برکتیں مادی بھی ہیں اور روحانی بھی۔ مادی حیثیت سے وہ دنیا کے نزدیک ترین علاقوں میں سے ہے۔ اور روحانی حیثیت سے وہ ۲ ہزار برس تک انبیاء عظیم السلام کا مہبط ہی ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے خطے میں اتنی کثرت سے انبیاء مبعوث نہیں ہوئے ہیں۔

۶۴ یعنی بیٹے کے بعد پوتا بھی ایسا ہوا جسے نبوت سے سرفراز کیا گیا۔

۶۵ حضرت ابراہیم کی زندگی کے اس اہم واقعے کا بائبل میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کے عراقی دور کا کوئی واقعہ بھی اس کتاب میں جگہ نہیں پاسکا ہے۔ فرد سے ان کی ٹڈ بھڑ، باپ اور قوم سے ان کی کشمکش، بت پرستی کے خلاف ان کی جدوجہد، آگ میں ڈالے جانے کا قصہ، اور بالآخر ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا، ان میں سے ہر چیز بائبل کی کتاب "پیدائش" کے مصنف کی نگاہ میں ناقابلِ التفات تھی۔ وہ صرف ان کی ہجرت کا ذکر کرتا ہے، مگر وہ بھی اس انداز سے کہ جیسے ایک خاندان تلاشِ معاش میں ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو رہا ہے۔ قرآن اور بائبل کا اس سے بھی زیادہ دھچپ اختلاف یہ ہے کہ قرآن کے بیان کی رو سے حضرت ابراہیم کا مشرک باپ ان پر ظلم کرنے میں پیش پیش تھا، اور بائبل کہتی ہے کہ ان کا باپ خود اپنے بیٹوں، پوتوں اور بہوؤں کے ساتھ حاران میں جا بسا (باب ۱۱-آیات ۲ تا ۳۲)۔ اس کے بعد یکایک خدا حضرت ابراہیم سے کہتا ہے کہ تو حاملن کو چھوڑ کر کنعان میں جا کر بس جا اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا، سو تو باعثِ برکت ہو، جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت

کرے اُس پر میں لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے“ (باب ۱۲ آیت ۱۳) کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک حضرت ابراہیم پر یہ نظر عنایت کیوں ہو گئی۔

تلمود میں البتہ سیرت ابراہیمی کے عرانی و ذری کی وہ بیشتر تفصیلات ملتی ہیں جو قرآن کے مختلف مقامات پر بیان ہوئی ہیں، مگر دونوں کا تقابل کرنے سے نہ صرف یہ کہ قصے کے اہم اجزاء میں بنی تفاوت نظر آتا ہے بلکہ ایک شخص صریح طور پر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ تلمود کا بیان بکثرت بے جوڑ اور خلاف قیاس باتوں سے بھرا ہوا ہے اور اس کے برعکس قرآن بالکل منقطع صورت میں حضرت ابراہیم کے اہم واقعات زندگی کو پیش کرتا ہے جن میں کوئی لغو بات آئے نہیں پائی ہے۔ تفسیر مدعائے یہ ہم یہاں تلمود کی داستان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ اُن لوگوں کی غلطی پوری طرح کھل جائے جو قرآن کو بائبل اور یہودی لٹریچر کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔

تلمود کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیم کی پیدائش کے روز نجر میوں نے آسمان پر ایک علامت دیکھ کر غمزدہ ہو کر مشورہ دیا تھا کہ تارح کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے اُسے قتل کر دے۔ چنانچہ وہ اُن کے قتل کے ورپے ہوا۔ مگر تارح نے اپنے ایک غلام کا بچہ ان کے بدلے میں دے کر انہیں بچا لیا۔ اس کے بعد تارح نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک غار میں لے جا کر چھپا دیا جہاں ۱۰ سال تک وہ رہے۔ گیارہویں سال حضرت ابراہیم کو تارح نے حضرت نوح کے پاس پہنچا دیا اور ۳۹ سال تک وہ حضرت نوح اور ان کے بیٹے سام کی تربیت میں رہے۔ اسی زمانے میں حضرت ابراہیم نے اپنی سگی بھتیجی سارہ سے نکاح کر لیا جو عمر میں ان سے ۲۴ سال چھوٹی تھیں۔ بائبل اس کی تصریح نہیں کرتی کہ سارہ حضرت ابراہیم کی بھتیجی تھیں۔ نیز وہ دونوں کے درمیان عمر کا فرق بھی صرف ۱۰ سال بتاتی ہے۔ پیدائش باب ۱۱-آیت ۲۹-اور باب ۱۲-آیت ۱۴

پھر تلمود کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم پچاس سال کی عمر میں حضرت نوح کا گھر چھوڑ کر اپنے باپ کے ہاں آگئے۔ یہاں انہوں نے دیکھا کہ باپ بت پرست ہے اور گھر میں سال کے بارہ مہینوں کے حساب سے ۱۲ بت رکھے ہیں۔ انہوں نے پہلے تو باپ کو سمجھانے کی کوشش کی، اور جب اس کی سمجھ میں بات نہ آئی تو ایک روز موقع پا کر اس گھر میں بت ختنے کو توڑ ڈالا۔ تارح نے آکر اپنے خداؤں کا یہ حال جو دیکھا تو سیدھا غمزدہ کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ ۵ برس پہلے میرے ہاں جوڑ کا پیدا ہوا تھا آج اس نے میرے گھر میں یہ حرکت کی،

آپ اس کا فیصلہ کیجیے۔ نمرود نے بلا کر حضرت ابراہیم سے باز پرس کی۔ انہوں نے سخت جوابات دیئے۔ نمرود نے اُن کو تو فوراً جیل بھیج دیا اور پھر معاملہ اپنی کونسل میں پیش کیا تاکہ صلاح مشورے سے اس مقدمہ کا فیصلہ کیا جائے۔ کونسل کے ارکان نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ آگ کا ایک بڑا لاٹھ تیار کر لیا گیا اور حضرت ابراہیم اس میں پھینک دیے گئے۔ حضرت ابراہیم کے ساتھ ان کے بھائی اور حمزہ، حاران کو بھی پھینکا گیا، کیونکہ نمرود نے تارح سے جب پوچھا کہ تیرے اس بیٹے کو تو میں پیدائش ہی کے روز قتل کرنا چاہتا تھا، تو نے اُس وقت اسے بچا کر دوسرا بچہ کیوں اس کے بدلے قتل کر لیا، تو اس نے کہا کہ میں نے حاران کے کہنے سے یہ حرکت کی تھی۔ اس لیے خود اس فعل کے مرتکب کو تو چھوڑ دیا گیا اور مشورہ دینے والے کو حضرت ابراہیم کے ساتھ آگ میں پھینکا گیا۔ آگ میں گرنے ہی حاران فوراً جل جہنم کر کوئلہ ہو گیا مگر حضرت ابراہیم کو لوگوں نے دیکھا کہ اندر اطمینان سے ٹہل رہے ہیں۔ نمرود کو اس معاملے کی اطلاع کی گئی۔ اس نے آکر جب خود اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھ لیا تو پکار کر کہا کہ ”آسمانی خدا کے بندے، آگ سے نکل آ اور میرے سامنے کھڑا ہو جا“ حضرت ابراہیم باہر آگئے۔ نمرود ان کا معتقد ہو گیا اور اس نے بہت سے قیمتی نذرانے ان کو دے کر رخصت کر دیا۔

اس کے بعد نمرود کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم دو سال تک وہاں رہے۔ پھر نمرود نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا اور اس کے نجومیوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ ابراہیم تیری سلطنت کی تباہی کا موجب بنے گا، اسے قتل کرادے۔ اُس نے قتل کے لیے آدمی بھیجے، مگر حضرت ابراہیم کو خود نمرود ہی کے عطلیے ہوئے ایک غلام، البعز نے قبل از وقت اس منصوبے کی اطلاع دے دی اور حضرت ابراہیم نے بھاگ کر حضرت نوح کے ہاں پناہ لی۔ وہاں تارح آکر اُن سے خفیہ طور پر ملتا رہا اور آخر باپ بیٹوں کی یہ صلاح ہوئی کہ ملک چھوڑ دیا جائے۔ حضرت نوح اور سام نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ تارح اپنے بیٹے ابراہیم اور پوتے لوط اور پوتی اور بہو سارہ کو لے کر اُس سے حاران چلا گیا۔ دستخطات نمرود۔ از ایچ پولانو، لندن صفحہ ۳۲ تا ۳۶

کیا اس داستان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ قرآن کا ماخذ ہو سکتی ہے؟

اور لوط کو ہم نے حکم اور علم بخشا اور اُسے اُس سببی سے بچا کر نکال دیا جو بدکاریاں کرتی تھی۔
درحقیقت وہ بڑی ہی بُری، فاسق قوم تھی۔ اور لوط کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ
صالح لوگوں میں سے نہایع

اور یہی نعمت ہم نے نوح کو دی۔ یاد کرو جبکہ ان سب سے پہلے اُس نے ہمیں پکارا تھا۔
ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے اور اس کے گھر والوں کو کربِ عظیم سے نجات دی اور
اُس قوم کے مقابلے میں اُس کی مدد کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ وہ بڑے بُرے لوگ
تھے۔ پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

اور اسی نعمت سے ہم نے داؤد و سلیمان کو سرفراز کیا۔ یاد کرو وہ موقع جبکہ وہ دونوں ایک
کھیت کے مقدمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں
پھیل گئی تھیں، اور ہم اُن کی عدالت کو خود دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمان کو
سمجھا دیا، حالانکہ حکم اور علم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا۔

۶۷ ”حکم اور علم بخشا“ بالعموم قرآن مجید میں نبوت عطا کرنے کا ہم معنی ہوتا ہے۔ ”حکم“ سے مراد حکمت بھی
ہے، صحیح قوت فیصلہ بھی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سند حکمرانی (AUTHORITY) حاصل ہونا بھی۔ ”ہم“ علم
تو اس سے مراد وہ علم حق ہے جو وحی کے ذریعہ عطا کیا گیا ہو۔ حضرت لوط کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے

ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد ۲ - صفحہ ۵۱ تا ۵۳ - ۲۱۲ - ۳۵۳ - ۳۵۵ تا ۳۵۹ - ۳۶۲ - ۴۸۹ - ۵۱۱ تا ۵۱۵ -

۶۸ اشارہ ہے حضرت نوح کی اس دعا کی طرف جو ایک مدت دراز تک اپنی قوم کی اصلاح کے لیے ناکام کوششیں
کرتے رہنے کے بعد آخر کار تھک کر انہوں نے مانگی تھی کہ ”إِنِّي مَغْلُوبٌ فَأَنْتِصِرْ“ پروردگار میں مغلوب ہو گیا ہوں
اب میری مدد کو پہنچ“ (القصہ - رکوع ۱)۔ اور دَبِّ لَا تَذَرُنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنْ أَكْثَرِ دِيَارٍ، ”پروردگار زمین
پر ایک کافر باشندہ بھی نہ چھوڑ“ (نوح - رکوع ۲)

۶۹ ربِّ عظیم سے مراد یا تو ایک بدکردار قوم کے درمیان زندگی بسر کرنے کی مصیبت ہے، یا پھر طوفان۔

حضرت نوح کے قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۰ تا ۴۴ - ۲۹۹ - ۳۰۱ تا ۳۰۳ - ۳۰۳ تا ۳۰۴ - ۵۹۱

نہ اس واقعے کا کوئی ذکر بائبل میں نہیں ہے، اور یہودی ٹریجر میں بھی نہیں اس کا کوئی نشان نہیں ملا۔ مسلمان مفسرین نے اس کی جو تشریح کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص کے کھیت میں دوسرے شخص کی بکریاں رات کے وقت گھس گئی تھیں۔ اُس نے حضرت داؤد کے ہاں استغاثہ کیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اُس کی بکریاں چھین کر اسے دے دی جائیں۔ حضرت سلیمان نے اس سے اختلاف کیا اور یہ رائے دی کہ بکریاں اُس وقت تک کھیت والے کے پاس رہیں جب تک بکری والا اُس کے کھیت کو پھر سے تیار نہ کر دے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ فیصلہ ہم نے سلیمان کو سنبھایا تھا۔ مگر چونکہ مقدمے کی یہ تفصیل قرآن میں بیان نہیں ہوئی ہے اور نہ کسی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصریح نقل ہوئی ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کے مقدمے میں یہی بات ثابت شدہ اسلامی قانون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور دوسرے فقہائے اسلام کے درمیان اس امر میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ اگر کسی کا کھیت دوسرے شخص کے جانور خراب کر دیں تو کوئی تاوان عائد ہو گا یا نہیں اور عائد ہو گا تو کس صورت میں ہو گا، نیز یہ کہ تاوان کی شکل کیا ہوگی۔

اس سیاق و سباق میں حضرت داؤد و سلیمان کے اس خاص واقعے کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبی ہونے اور اللہ کی طرف سے غیر معمولی طاقتیں اور توابلیتیں پانے کے باوجود ہوتے انسان ہی تھے، الوہیت کا کوئی شائبہ ان میں نہ ہوتا تھا۔ اس مقدمے میں حضرت داؤد کی رہنمائی وحی کے ذریعہ سے نہ کی گئی اور وہ فیصلہ کرنے میں غلطی کر گئے۔ حضرت سلیمان کی رہنمائی کی گئی اور انہوں نے صحیح فیصلہ کیا۔ حالانکہ نبی دونوں ہی تھے۔ آگے ان دونوں بزرگوں کے جن کمالات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی یہی بات سمجھانے کے لیے ہے کہ یہ عطائی کمالات تھے اور اس طرح کے کمالات کسی کو خدا نہیں بنا دیتے۔ ضمناً اس آیت سے عدالت کا یہ اصول بھی معلوم ہوا کہ اگر دونوں ایک مقدمے کا فیصلہ کریں، اور دونوں کے فیصلے مختلف ہوں، تو اگرچہ صحیح فیصلہ ایک ہی کا ہو گا، لیکن دونوں برحق ہونگے، بشرطیکہ عدالت کرنے کی ضروری استعداد دونوں میں موجود ہو، ان میں سے کوئی جہالت اور نا تجربہ کاری کے ساتھ عدالت کرنے نہ بیٹھ جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں اس بات کو اور زیادہ کھول کر

داؤد کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے، اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے۔ اور ہم نے اُس کو تمہارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی

بیان فرما دیا ہے۔ بخاری میں عمرو بن العاص کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا اذا اجتهد الحاكم فاصاب فله اجران واذا اجتهد فاحطاً فله اجرٌ۔ اگر حاکم اپنی حد تک حق فیصلہ کرنے کی پوری کوشش کرے تو صحیح فیصلہ کرنے کی صورت میں اُس کے لیے دہرا اجر ہے اور غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں اکہرا اجر۔ ابو داؤد اور ابن ماجہ میں بڑیدہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا قاضی تین قسم کے ہیں، ایک ان میں سے جنتی ہے اور دو جہنمی۔ جنتی وہ قاضی ہے جو حق کو پہچان جائے تو اس کے مطابق فیصلہ دے۔ مگر جو شخص حق کو پہچاننے کے باوجود خلاف حق فیصلہ دے تو وہ جہنمی ہے۔ اور اسی طرح وہ جہنمی ہے جو علم کے بغیر لوگوں کے فیصلے کرنے کے لیے میٹھ جائے۔

اِنَّ مَعَ دَاوُدَ كَافَّةً مِنَ الطَّيْرِ، لَیْسَ دَاوُدَ كَافَّةً مِنَ الطَّيْرِ، یعنی ”داؤد علیہ السلام کے لیے نہیں بلکہ ان کے ساتھ ”پہاڑ اور پرندے مسخر کیے گئے تھے، اور اس تسخیر کا حاصل یہ تھا کہ وہ بھی حضرت ممدوح کے ساتھ اللہ کی تسبیح کرتے تھے۔ یہی بات سورہ ص میں بیان کی گئی ہے، اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ یُسَبِّحُنَّ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَّهِ آوَابٌ، ”ہم نے اُس کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا کہ صبح و شام تسبیح کرتے تھے، اور پرندے بھی مسخر کر دیے تھے جو اکٹھے ہو جاتے تھے، سب اُس کی تسبیح دہراتے تھے“ سورہ سبا میں اس کی مزید وضاحت یہ مٹی ہے یا جِبَالٌ أَوْ یُّمُّنٌ مَّعَهُ وَالطَّيْرُ، ”پہاڑوں کو ہم نے حکم دیا کہ اُس کے ساتھ تسبیح دہراؤ، اور یہی حکم پرندوں کو دیا“ ان ارشادات سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد جب اللہ کی حمد و ثناء کے گیت گاتے تھے تو ان کی بلند اور سرلی آواز سے پہاڑ گونج اُٹھتے تھے پرندے ٹھہر جاتے تھے اور ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ اس معنی کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ذکر آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جو غیر معمولی طور پر خوش آواز بزرگ تھے، قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے تو ان کی آواز سن کر کھڑے ہو گئے اور دیر تک سنتے رہے۔ جب وہ ختم کر چکے تو آپ نے فرمایا لفتل ادتی من ماراً من مزامیرال داؤد، یعنی اس شخص

تھی، تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے، پھر کیا تم شکر گزار ہو؟ اور سلیمان کے لیے ہم نے کو داؤد کی خوش آوازی کا ایک حصہ ملا ہے۔

۱۷ سورہ سبا میں مزید تفصیل یہ ہے: **وَلَا تَأْتِيهِ الْخَبِيدَاتُ إِنَّهُنَّ لَمْ يَخْلُقْنَ سِغَاتٍ وَقَدْ آتَيْنَا فِي السُّورِ** وہ اور ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا (اور اس کو ہدایت کی) کہ پوری پوری زر میں بنا اور ٹھیک انداز سے کڑیاں جوڑے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو لوہے کے استعمال پر قدرت عطا کی تھی، اور خاص طور پر جنگی اغراض کے لیے زرہ سازی کا طریقہ سکھایا تھا۔ موجودہ زمانے کی تاریخی و اثری تحقیقات سے ان آیات کے معنی پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں لوہے کے استعمال کا دور (IRON AGE)

۱۸ سورہ ق م کے درمیان شروع ہوا ہے، اور یہی حضرت داؤد کا زمانہ ہے۔ اول اول شام اور ایشیائے کوچک کی جتنی قوم (Hittites) کو لوہے کے پھلانے اور تیار کرنے کا ایک پیچیدہ طریقہ معلوم ہوا اور وہ شدت کے ساتھ اس کو دنیا بھر سے راز میں رکھے رہی۔ مگر اس طریقے سے جو لوہا تیار ہوتا تھا وہ سونے چاندی کی طرح اتنا قیمتی ہوتا تھا کہ عام استعمال میں نہ آسکتا تھا۔ بعد میں فلسطینیوں نے یہ طریقہ معلوم کر لیا، اور وہ بھی اسے راز ہی میں رکھتے رہے۔ طاوت کی بادشاہی سے پہلے جتییوں اور فلسطینیوں نے بنی اسرائیل کو پیہم شکستیں دے کر جس طرح فلسطین سے بے دخل کر دیا تھا، بائبل کے بیان کے مطابق اس کے وجوہ میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ یہ لوگ لوہے کی رتھیں استعمال کرتے تھے اور ان کے پاس دوسرے آہنی ہتھیار بھی تھے (یشوع باب ۱۷-آیت ۱۶-قضاۃ باب ۱-آیت ۱۹-باب ۴-آیت ۲-۳)۔ سورہ ق م میں جب طاوت خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کا فرمانروا ہوا تو اس نے پیہم شکستیں دے کر ان لوگوں سے فلسطین کا برا حصہ واپس لے لیا، اور پھر حضرت داؤد (سورہ ۹۵ ق م) نے نہ صرف فلسطین و شرق اردن، بلکہ شام کے بھی بڑے حصے پر اسرائیلی سلطنت قائم کر دی۔ اس زمانہ میں آہن سازی کا وہ راز جو جتییوں اور فلسطینیوں کے قبضے میں تھا، بے نقاب ہو گیا، اور صرف بے نقاب ہی نہ ہوا بلکہ آہن سازی کے ایسے طریقے بھی نکل آئے جن سے عام استعمال کے لیے لوہے کی سستی چیزیں تیار ہونے لگیں، فلسطین کے جنوب میں اڈوم کا علاقہ خام لوہے (IRON ORE)

تیسرے ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں، ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے۔ اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو

کی دولت سے بالامال ہے، اور حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں، ان میں بکثرت ایسی جگہوں کے آثار ملے ہیں جہاں لوہا پگھلانے کی بھٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ عقیقہ (ایلیہ) سے متصل حضرت سلیمان کے زمانے کی بندرگاہ۔ عقیقوں جابر کے آثارِ قدیمہ میں جو بھٹی ملی ہے اس کے معاملے سے اندازہ کیا گیا ہے کہ اس میں بعض وہ اصول استعمال کیے جاتے تھے جو آج جدید ترین زمانے کی (BLAST

FURNACES) میں استعمال ہوتے ہیں۔ اب یہ ایک قدرتی بات ہے کہ حضرت داؤد نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس جدید دریافت کو جنگی اغراض کے لیے استعمال کیا ہوگا، کیونکہ تھوڑی سی مدت پہلے اُس پاس کی دشمن قوموں نے اسی لوہے کے ہتھیاروں سے اُن کی قوم پر عرصہ حیات تلک کر دیا تھا۔

۳۷ حضرت داؤد کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول ص ۱۹۱۔ جلد دوم ص ۵۹۷-۶۲۲۔

۳۸ اس کی تفصیل سورہ سبا میں یہ آئی ہے: وَلِسَيِّمُنَ الْإِبْرِيمَ عِنْدَ شَهْرٍ دَرَوَا حُثَا شَهْرٍ؟ اور سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، ایک چیمینے کی راہ تک اس کا چلنا صبح کو اور ایک چیمینے کی راہ تک اُس کا چلنا شام کو۔ پھر اس کی مزید تفصیل سورہ ص میں یہ آئی ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الْإِبْرِيمَ نَجْرِي بِأَحْرَبٍ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ؟ پس ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے سہولت چلتی تھی جدھر وہ جانا چاہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوا کو حضرت سلیمان کے لیے اس طرح تابع امر کر دیا گیا تھا کہ ان کی مملکت سے ایک چیمینے کی راہ تک کے مقامات کا سفر سہولت کیا جاسکتا تھا۔ جانے میں بھی ہمیشہ ان کی مرضی کے مطابق بادِ موائق ملتی تھی اور واپسی پر بھی۔ بائبل اور جدید تاریخی تحقیقات سے اس مضمون پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان نے اپنے دورِ سلطنت میں بہت بڑے پیمانے پر بحری تجارت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک طرف عقیقوں جابر سے ان کے تجارتی جہاز بحرِ اعراب میں اود دوسرے جنوبی و مشرقی ممالک کی طرف جاتے تھے۔ اور دوسری طرف بحرِ روم کے بندرگاہوں سے ان کا

اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔ اُن سب کے نگراں ہم ہی تھے۔

پڑھ (جسے بائبل میں ”ترسیسی ٹیڑھ“ کہا گیا ہے) مغربی مالک کی طرف جایا کرتا تھا۔ عیسویں جاہر میں ان کے زمانے کی جو عظیم الشان بھٹی ملی ہے اس کے مقابلے کی کوئی بھٹی مغربی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں ابھی تک نہیں ملی۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہاں اُدوم کے علاقہ عَرَب کی کانوں سے خام لوہا اور تانبا لایا جاتا تھا اور اس بھٹی میں گچھلا کر اسے دوسرے کاموں کے علاوہ جہاز سازی میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے قرآن مجید کی اُس آیت کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے جو سورہ سبا میں حضرت سلیمان کے متعلق آئی ہے کہ **وَأَسَدْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ** اور ہم نے اس کے لیے گچھلی ہوئی دھات کا چشمہ بہا دیا۔“ نیز اس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت سلیمان کے لیے ایک چیمنے کی راتہ تک ہوا کی رفتار کو مسخر کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اُس زمانے میں بحری سفر کا سارا انحصار بادِ موافق ملنے پر تھا، اور اللہ تعالیٰ کا حضرت سلیمان پر یہ کرم خاص تھا کہ وہ ہمیشہ اُن کے دونوں بحری بیڑوں کو اُن کی مرضی کے مطابق ملتی تھی۔ تاہم اگر ہوا پر حضرت سلیمان کو حکم چلانے کا بھی کوئی اقتدار دیا گیا ہو، جیسا کہ **تَجْرِىٰ يَاحُيُّ** اس کے حکم سے چلتی تھی، کے ظاہر الفاظ سے مترشح ہونا ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں ہے۔ وہ اپنی مملکت کا آپ مالک ہے۔ اپنے جس بندے کو جو اختیارات چاہے دے سکتا ہے جب وہ خود کسی کو کوئی اختیار دے تو ہمارا دل دھکنے کی کوئی وجہ نہیں۔

سورہ سبا میں اس کی تفصیل یہ آئی ہے: **وَمِنَ الْجِبِّ مَن يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ، وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُنْزِلْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ۔ يَّعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُونَ مِنْ تَحَارِيْبٍ وَمَنْ شَاءَ وَجَفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَّاسِيَاتٍ۔۔۔۔۔ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِبَّتُ أَنْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ** اور جنوں میں سے ایسے جن ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیے تھے جو اس کے رب کے حکم سے اُس کے آگے کام کرتے تھے اور جو ہمارے حکم سے کوئی ان میں سے انحراف کرتا تو ہم اس کو بھڑکتی ہوئی آگ کا مڑا چھٹانے۔ وہ اُس کے لیے جیسے وہ چاہتا تھا اور محبت سے اور حوض جیسے بڑے بڑے لگن اور بھاری جہی ہوئی دیکھیں بناتے تھے۔۔۔۔۔ پھر

اور یہی (ہوشمندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوبؑ کو دی تھی۔ یاد کرو جبکہ اس نے اپنے رب جب ہم نے سیماں کو وفات دے دی تو ان جنوں کو اس کی موت پر مطلع کرنے والی کوئی چیز نہ ملتی مگر زمین کا کھڑا (یعنی گھٹن) جو ان کے عصا کو کھار یا تھا۔ پس جب وہ گر پڑا تو جنوں کو پتہ چل گیا کہ اگر وہ واقعی غیب داں ہوتے تو اس زلزلت کے عذاب میں اتنی مدت تک مبتلا نہ رہتے۔ اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو شیاطین حضرت سیماں کے بیسے مستخر ہوئے تھے، اور جو ان کے لیے مختلف خدمات انجام دیتے تھے، وہ جن تھے، اور جن بھی وہ جن بن کے بارے میں مشرکین عرب کا یہ عقیدہ تھا، اور جو خود اپنے بارے میں بھی یہ غلط فہمی رکھتے تھے کہ ان کو علم غیب حاصل ہے۔ اب ہر شخص جو قرآن مجید کو آنکھیں کھول کر پڑھے، اور اس کو اپنے نقصات اور پیشگی قائم کیے ہوئے نظریات کا تابع بنائے بغیر پڑھے، یہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جہاں قرآن مطلقاً "شیطان" اور "جن" کے الفاظ استعمال کرتا ہے وہاں اس کی مراد کوئی مخلوق ہوتی ہے، اور قرآن کی رو سے وہ کون سے جن ہیں جن کو مشرکین عرب عالم الغیب سمجھتے تھے۔

جدید زمانے کے مفسرین یہ ثابت کرنے کے لیے ایٹری چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں کہ وہ جن اور شیاطین جو حضرت سیماں کے لیے مستخر کیے گئے تھے، انسان تھے اور اس پاس کی قوموں میں سے فراہم ہوئے تھے۔ لیکن عرب یہی نہیں کہ قرآن کے الفاظ میں ان کی اس تاویل کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ قرآن میں جہاں جہاں بھی یہ قصہ آیا ہے وہاں کا سیاق و سباق اور انداز بیان اس تاویل کو راہ دینے سے صاف انکار کرتا ہے۔ حضرت سیماں کے لیے عمارتیں بنانے والے اگر انسان ہی تھے تو آخر یہ انہی کی کوئی خصوصیت تھی جس کو اس شان سے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ ابراہم مصری سے لے کر نبویارک کی نلک شکاف عمارتوں تک کس چیز کو انسانوں نے نہیں بنایا ہے اور کس بادشاہ یا رئیس یا ملک التجار کے لیے وہ "جن" اور "شیاطین" فراہم نہیں ہوئے جو آپ حضرت سیماں کے لیے فراہم کردہ ہیں؟

۱۷۵ حضرت ایوب کی شخصیت، زمانہ، قومیت، ہر چیز کے بارے میں اختلاف ہے۔ جدید زمانے کے محققین میں سے کوئی ان کو اسرائیلی قرار دیتا ہے، کوئی مصری اور کوئی عرب۔ کسی کے نزدیک ان کا زمانہ حضرت موسیٰ سے پہلے کا ہے، کوئی انہیں حضرت داؤد و سلیمان کے زمانے کا آدمی قرار دیتا ہے، اور کوئی ان سے بھی متاخر

کو پکارا کہ ”مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے“ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور تو تکلیف اُسے تھی اُس کو دور کر دیا، اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیکھتے بلکہ ان کے ساتھ اتنے لیکن سب کے قیاسات کی بنیاد اُس سفر ایوب یا صحیفہ ایوب پر ہے جو بائبل کے مجموعہ کتب مقدسہ میں شامل ہے۔ اسی کی زبان، انداز بیان اور موادِ کلام کو دیکھ کر یہ مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں، کہ کسی اور تاریخی شہادت پر۔ اور اس سفر ایوب کا حال یہ ہے کہ اس کے اپنے مضامین میں بھی تضاد ہے اور اس کا بیان قرآن مجید کے بیان سے بھی اتنا مختلف ہے کہ دونوں کو بیک وقت نہیں مانا جاسکتا۔ لہذا ہم اُس پر قطعاً اعتقاد نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ قابلِ اعتماد شہادت اگر کوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ یسعیاہ نبی اور عیسیٰ نبی کے صحیفوں میں ان کا ذکر آیا ہے، اور یہ صحیفے تاریخی حیثیت سے زیادہ مستند ہیں۔ یسعیاہ نبی آٹھویں صدی اور عیسیٰ نبی پہلی صدی قبل مسیح میں گزرے ہیں، اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نویں صدی یا اس سے پہلے کے بزرگ ہیں۔ یہی ان کی قومیت تو سورہ نساء (رکوع ۲۳) اور سورہ انعام (رکوع ۱۰) میں جس طرح ان کا ذکر آیا ہے اس سے گمان تو یہی ہوتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل ہی میں سے تھے، مگر وہ بنی اسرائیل کا یہ بیان بھی کچھ بعید از قیاس نہیں ہے کہ وہ حضرت اسحاق کے بیٹے عیسو کی نسل سے تھے۔

لکھے دعا کا انداز کس قدر لطیف ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں اپنی تکلیف کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد بس یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ ”تو ارحم الراحمین ہے“ آگے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں، کوئی عرضِ مدعا نہیں، کسی چیز کا مطالبہ نہیں۔ اس طرزِ دعا میں کچھ ایسی شان نظر آتی ہے جیسے کوئی انتہائی صابر و قانع اور شریف و خوددار آدمی ہے درپے فاقوں سے بے تاب ہو اور کسی نہایت کریم النفس سستی کے سامنے بس اتنا کہہ کر رہ جائے کہ میں بھوکا ہوں اور آپ فیاض ہیں۔ آگے کچھ اس کی زبان سے نہ نکل سکے۔

میں سورہ ص کے چوتھے رکوع میں اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا اذْکُفْ بِرِجْدِكَ هَذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ، اپنا پاؤں مارو، یہ ٹھنڈا پانی موجود ہے نہانے کو اور پینے کو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر پاؤں مارتے ہی اللہ نے ان کے لیے ایک قدرتی چشمہ جاری کر دیا جس کے پانی میں یہ خاصیت تھی کہ اس سے غسل کرنے اور اس کو پینے سے ان کی بیماری دور ہو گئی۔ یہ علاج اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کو کوئی سخت

ہی اور بھی دیے، اپنی خاص رحمت کے طور پر، اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے۔
جلدی بیماری ہو گئی تھی، اور بائبل کا بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ ان کا جسم سر سے پاؤں تک پھوڑوں سے بھر گیا
تھا (ایوب، باب ۲، آیت ۷)۔

۱۷ اس قصے میں قرآن مجید حضرت ایوب کو اس شان سے پیش کرتا ہے کہ وہ صبر کی تصویر نظر آتے ہیں، اور
پھر کہتا ہے کہ ان کی زندگی عبادت گزاروں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ لیکن دوسری طرف بائبل کی سفر ایوب پڑھیے
نور وہاں آپ کو ایک ایسے شخص کی تصویر نظر آئے گی جو خدا کے خلاف مجسم شکایت، اور اپنی مصیبت پر ہمہ تن فریاد
بنا ہوا ہے۔ بار بار اُس کی زبان سے یہ فقرے ادا ہوتے ہیں ”مالو ہو وہ دن جس میں میں پیدا ہوا“ ”میں رحم
ہی میں کیوں نہ مر گیا“ ”میں نے پیٹ سے نکلتے ہی کیوں نہ جان دے دی“ اور بار بار وہ خدا کے خلاف شکایتیں
کرتا ہے کہ ”تا دیرِ مطلق کے تیر میرے اندر لگے ہوٹے ہیں، میری روح انہی کے زہر کو پی رہی ہے، خدا کی ڈراؤنی
باتیں میرے خلاف صف باندھے ہوئے ہیں“ ”اے بنی آدم کے ناظر، اگر میں نے گناہ کیا ہے تو تیرا کیا بگاڑتا
ہوں؟ تو نے کیوں مجھے اپنا نشانہ بنا لیا ہے یہاں تک کہ میں اپنے آپ پر بوجھ ہوں؟ تو میرا گناہ کیوں نہیں مٹا
کہ تا اور میری بدکاری کیوں نہیں دور کر دیتا؟“ ”میں خدا سے کہوں گا کہ مجھے ملزم نہ ٹھیرا مجھے بتا کہ تو مجھ سے کیوں
جھگڑتا ہے؟ کیا تجھے اچھا لگتا ہے کہ اندھیر کرے اور اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز کو حقیر جانے اور شریروں
کی مشورت کو روشن کرے؟ اُس کے تین دوست اگر اسے تسلی دیتے ہیں اور اس کو صبر اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتے
ہیں، مگر وہ نہیں مانتا۔ وہ ان کی تلقین کے جواب میں پے درپے خدا پر الزام رکھے چلا جاتا ہے اور ان کے
سمجھانے کے باوجود اصرار کرتا ہے کہ خدا کے اس فعل میں کوئی حکمت و مصلحت نہیں ہے، صرف ایک ظلم ہے
جو مجھ جیسے ایک متقی و عبادت گزار آدمی پر کیا جا رہا ہے۔ وہ خدا کے اس انتظام پر سخت اعتراضات کرتا ہے کہ
ایک طرف بدکار نوازے جاتے ہیں اور دوسری طرف نیکو کار ستائے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی
نیکیاں گنتا ہے اور پھر وہ تکلیفیں بیان کرتا ہے جو ان کے بدلے میں خدا نے اس پر ڈالیں، اور پھر کہتا ہے کہ
خدا کے پاس اگر کوئی جواب ہے تو وہ مجھے بتائے کہ یہ سلوک میرے ساتھ کس تصور کی پاداش میں کیا گیا ہے۔ اس
کی یہ زبان درازی اپنے خالق کے مقابلے میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ آخر کار اُس کے دوست اس کی باتوں کا

جواب دینا چھڑ دیتے ہیں۔ وہ چپ سہ جاتے ہیں تو ایک چوتھا آدمی جو ان کی باتیں خاموش سن رہا تھا بیچ میں دخل دیتا ہے اور ایوب کو بے تحاشا اس بات پر ڈانٹتا ہے کہ ”اُس نے خدا کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو راست ٹھہرایا۔“ اس کی تقریر ختم نہیں ہوتی کہ بیچ میں اللہ میاں خود بول پڑتے ہیں اور پھر ان کے اور ایوب کے درمیان خوب دبدب و بحث ہوتی ہے۔ اس ساری داستان کو پڑھتے ہوئے کسی جگہ بھی ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اُس صبرِ محکم کا حال اور کلام پڑھ رہے ہیں جس کی تصویر عبادت گزاروں کے لیے سبق بنا کر قرآن نے پیش کی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کا ابتدائی حصہ کچھ کہہ رہا ہے، بیچ کا حصہ کچھ، اور آخر میں نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے۔ تینوں حصوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ابتدائی حصہ کہتا ہے کہ ایوب ایک نہایت راست باز، خدا ترس اور نیک شخص تھا، اور اس کے ساتھ اتنا دولت مند کہ ”اہل مشرق میں وہ سب بڑا آدمی تھا“ ایک روز خدا کے ہاں اُس کے (یعنی خود اللہ میاں کے) بیٹے حاضر ہوئے اور ان کے ساتھ شیطان بھی آیا۔ خدا نے اس محفل میں اپنے بندے ایوب پر غر کا اظہار کیا۔ شیطان نے کہا آپ نے جو کچھ اسے دے رکھا ہے اُس کے بعد وہ شکر نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ ذرا اس کی نعمت چھین کر دیکھیے۔ وہ آپ کے منہ پر آپ کی تکفیر نہ کرے تو میرا نام شیطان نہیں۔ خدا نے کہا، اچھا اُس کا سب کچھ تیرے اختیار میں دیا جاتا ہے البتہ اس کی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچائو۔ شیطان نے جا کر ایوب کے تمام مال و دولت کا اور اس کے پورے خاندان کا صفایا کر دیا اور ایوب ہر چیز سے محروم ہو کر بالکل اکیلا رہ گیا۔ مگر ایوب کی آنکھ پر میل نہ آیا۔ اس نے خدا کو سجدہ کیا اور کہا ”ننگا ہی میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو“ پھر ایک دن ویسی ہی محفل اللہ میاں کے ہاں جمی۔ ان کے بیٹے بھی آئے اور شیطان بھی حاضر ہوا۔ اللہ میاں نے شیطان کو بتایا کہ دیکھ لے، ایوب کیسا راست باز آدمی ثابت ہوا۔ شیطان نے کہا، جناب، ذرا اس کے جسم پر مصیبت ڈال کر دیکھیے۔ وہ آپ کے منہ پر آپ کی ”تکفیر“ کرے گا۔ اللہ میاں نے فرمایا، اچھا، جا، اُس کو تیرے اختیار میں دیا گیا، بس اس کی جان محفوظ رہے۔ چنانچہ شیطان واپس ہوا اور اُس نے ”ایوب کو تلوے سے چاند تک دردناک پھڑروں سے دکھ دیا“ اس کی

بیوی نے اس سے کہا: ”کیا تو اب بھی اپنی راستی پر قائم رہے گا؟ خدا کی تکفیر کر اور مر جا!“ اس نے جواب دیا: ”تو نادان عہدت کی سی باتیں کرتی ہے۔ کیا ہم خدا کے ہاتھ سے سکھ پائیں اور دکھ نہ پائیں؟“

یہ ہے سیدنا ایوب کے پہلے اور دوسرے باب کا خلاصہ۔ لیکن اس کے بعد تفسیر کے باب سے ایک دوسری مضمون شروع ہوتا ہے جو بایبلیوں باب تک ایوب کی بے صبری اور خدا کے خلاف شکایات و الزامات کی ایک مسلسل داستان ہے، اور اس سے پوری طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایوب کے بارے میں خدا کا اندازہ غلط اور شیطان کا اندازہ صحیح تھا۔ پھر بایبلیوں باب میں غافلہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ میاں سے خوب و بد و محبت کر لینے کے بعد، صبر و شکر اور توبہ کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ میاں کی ڈانٹ کھا کر، ایوب ان سے معافی مانگ عیتا ہے اور وہ اسے قبول کر کے اس کی تکلیفیں دور کر دیتے ہیں اور تینا کچھ پہلے اس کے پاس تھا اس سے دو چھپتا ہے دے دیتے ہیں۔ اس آخری حصے کو پڑھتے وقت آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایوب اور اللہ میاں، دونوں شیطان کے چیلنج کے مقابلے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں، اور پھر محض اپنی بات رکھنے کے لیے اللہ میاں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے معافی مانگنے پر مجبور کیا ہے، اور اس کے معافی مانگتے ہی اسے قبول کر لیا ہے تاکہ شیطان کے سامنے ان کی سیٹی نہ ہو۔

یہ کتاب خود اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ یہ نہ خدا کا کلام ہے، نہ خود حضرت ایوب کا۔ بلکہ حضرت ایوب کے زمانے کی بھی نہیں ہے۔ ان کے صدیوں بعد کسی شخص نے قصہ ایوب کو بنیاد بنا کر یوسف زلیخا کی طرح ایک داستان لکھی ہے اور اس میں ایوب، الیگزینڈریائی، سوخی بلد و نعماتی صنوفر، براہیل بوزی کا بیٹا الیہو چند کیرکٹر ہیں جن کی زبان سے نظام کائنات کے متعلق دراصل وہ خود اپنا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری اور اس کے زور بیان کی جس قدر جی چاہے داد دے لیجیے، مگر کتب مقدسہ کے مجموعے میں ایک صحیفہ آسمانی کی حیثیت سے اس کو جگہ دینے کے کوئی معنی نہیں۔ ایوب علیہ السلام کی سیرت سے اس کا بس اتنا ہی تعلق ہے جتنا ”یوسف زلیخا“ کا تعلق سیرت یوسفی سے ہے، بلکہ شاید اتنا بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے ابتدائی اور آخری حصے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں صحیح تاریخ کا ایک عنصر پایا جاتا ہے، اور وہ شاعر نے یا تو زبانی روایات سے لیا ہو گا جو اس کے زمانے میں مشہور ہونگی، یا پھر کسی صحیفے سے اخذ کیا ہو گا جو اب ناپید ہے۔

اور یہی نعمت اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے۔ اور ان کو ہم نے

سے تشریح کے لیے سورہ مریم رکوع ۴ کے حواشی ملاحظہ ہوں

”ذوالکفل کا لفظی ترجمہ ہے ”صاحب نصیب“، اور مراد ہے اخلاقی بزرگی اور ثواب آخرت کے لحاظ سے صاحب نصیب، نہ کہ دنیوی فوائد و منافع کے لحاظ سے۔ یہ ان بزرگ کا نام نہیں بلکہ لقب ہے۔ قرآن مجید دو جگہ ان کا ذکر آیا ہے اور دونوں جگہ ان کو اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ نام نہیں دیا گیا۔

مفسرین کے اقوال اس معاملہ میں بہت مضطرب ہیں کہ یہ بزرگ کون ہیں، کس ملک اور قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اور کس زمانے میں گزرے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ حضرت زکریا کا دوسرا نام ہے (حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے، کیونکہ ان کا ذکر ابھی آگے آ رہا ہے)، کوئی کہتا ہے یہ حضرت ایسا ہیں، کوئی یوشع بن نون کا نام بتاتا ہے، کوئی کہتا ہے الیسع ہیں (حالانکہ یہ بھی غلط ہے، سورہ ص میں ان کا ذکر الگ کیا گیا ہے اور ذوالکفل کا الگ)، کوئی انہیں حضرت الیسع کا خلیفہ بتاتا ہے، اور کسی کا قول ہے کہ یہ حضرت ایوب کے بیٹے تھے جو ان کے بعد نبی ہوئے اور ان کا اصلی نام بشر تھا۔ آلودی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ حزقیال (حزقی ایل) نبی ہیں جو بنی اسرائیل کی اسیری کے زمانے میں نبوت پر سرفراز ہوئے اور نہر خابرد کے کنارے ایک بستی میں فرائض نبوت انجام دیتے رہے۔“

ان مختلف اقوال کی موجودگی میں یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ فی الواقع یہ کون سے نبی ہیں۔ موجود زمانے کے مفسرین نے اپنا میلان حزقی ایل نبی کی طرف ظاہر کیا ہے، لیکن ہمیں کوئی معقول دلیل ایسی نہیں ملی جس کی بنا پر یہ رائے قائم کی جاسکے۔ تاہم اگر اس کے لیے کوئی دلیل مل سکے تو یہ رائے قابل ترجیح ہو سکتی ہے، کیونکہ بائبل کے صحیفہ حزقی ایل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ اس تعریف کے مستحق ہیں جو اس آیت میں کی گئی ہے، یعنی صابر اور صالح۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو یروشلم کی آخری تباہی سے پہلے بخت نصر کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے تھے۔ بخت نصر نے عراق میں اسرائیلی قیدیوں کی ایک نوآبادی دیہائے خابرد کے کنارے قائم کر دی تھی جس کا نام تل ابیب تھا۔ اسی مقام پر ۱۹۵۵ ق م میں حضرت حزقی ایل نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے، جبکہ ان کی عمر ۳۰ سال تھی، اور مسلسل ۲۲ سال ایک طرف گرفتار بلا اسرائیلیوں کو اور دوسری طرف

اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے۔

اور مچھلی واسے کہ بھی ہم نے نوازا۔ یاد کرو جبکہ وہ بگڑ کر چلا گیا اور سمجھا کہ ہم اس پر قابو نہ پاسکیں گے۔ آخر کو اس نے تاریکیوں میں سے پکارا۔ نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات بے شک میں نے قصور کیا۔ تب ہم نے اس کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی، اور اسی طرح ہم مومنوں کو بچا لیا کرتے ہیں۔

اور زکریا کو، جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ ”اے پروردگار، مجھے اکیلا نہ چھوڑ، اور بہترین

یر دشمن کے غافل و سرشار باشندوں اور حکمرانوں کو چونکانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کا عظیم میں ان کے انہماک کا جو حال تھا اُس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نبوت کے نویں سال ان کی بیوی، جنہیں وہ خود ”منظورِ نظر“ کہتے ہیں، انتقال کر جاتی ہیں، لوگ ان کی تعزیت کے لیے جمع ہوتے ہیں، اور یہ اپنا دکھڑا چھوڑ کر اپنی ملت کو خدا کے اُس عذاب سے ڈرنا شروع کر دیتے ہیں جو اُس کے سر پر تھلا کھڑا تھا (باب ۲۲- آیات ۱۵-۷۲)۔ بائبل کا صحیفہ حزقی ایل اُن صحیفوں میں سے ہے جنہیں پڑھ کر واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الہامی کلام ہے۔

۱۰ مراد میں حضرت یونس۔ کہیں ان کا نام لیا گیا ہے اور کہیں ”ذوالنون“ اور ”صاحب الموت“ یعنی ”مچھلی واسے“ کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مچھلی والا انہیں اس لیے نہیں کہا گیا کہ وہ مچھلیاں بکرتے یا بیچتے تھے بلکہ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا تھا جیسا کہ سورہ صافات (رکوع ۵) میں بیان ہوا ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۲۱۲-۲۱۳۔

۱۱ یعنی وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے قبل اس کے کہ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم آتا اور ان کے لیے اپنی ڈیوٹی چھوڑنا جائز ہوتا۔

۱۲ انہوں نے خیال کیا کہ اس قوم پر تو عذاب آنے والا ہے۔ اب مجھے کہیں چل کر پناہ یعنی چاہیے تاکہ بخیر و بھلائی عذاب میں نہ گھر جاؤں۔ گویا وہ اس گمان میں تھے کہ وہ خود اپنی تدبیر سے اپنے آپ کو عذاب سے بچا سکتے ہیں۔

وارث تو توہی ہے۔ پس ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دؤر دھوپ کرتے تھے اور میں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے، اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔

اور وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ ہم نے اُس کے اندر اپنی رُوح سے

ہم یعنی مچھلی کے پیٹ میں سے جو خود تاریک تھا، اور اوپر سے سمندر کی تاریکیاں فرید۔

تفسیر کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۲۴ تا ۲۵۔ اور سورہ مریم رکوع اول کے حواشی۔ بیوی کو درست کر دینے سے مراد ان کا باطن پر نور کر دینا اور سن رسیدگی کے باوجود حمل کے قابل بنا دینا ہے۔ بہترین اثر تو توہی ہے، یعنی تو اولاد نہ بھی دے تو غم نہیں، تیری ذات پاک وارث ہونے کے لیے کافی ہے۔

کھم اس سباق و سباق میں انبیاء کا ذکر جس مقصد کے لیے کیا گیا ہے اسے پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ حضرت زکریا کے واقعے کا ذکر کرنے سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ یہ سارے نبی محض بندے اور انسان تھے۔ الوہیت کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ دوسروں کو اولاد بخشنے والے نہ تھے بلکہ خود اللہ کے آگے اولاد کے لیے ہاتھ پھیلاتے رہے۔ تھے۔ حضرت یونس کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ایک نبی اولوالعزم ہونے کے باوجود جب ان سے قصور سرزد ہوا تو نہ رازے ڈالی گئی، اور جب وہ اپنے رب کے آگے جھک گئے تو ان پر فضل بھی ایسا کیا گیا کہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال لائے گئے۔ حضرت ایوب کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ نبی کا مبتلا مصیبت ہونا کوئی زالی بات نہیں ہے، اور نبی بھی جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو خدا ہی کے آگے شفا کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ وہ دوسروں کو شفا دینے والا نہیں، خدا سے شفا مانگنے والا ہوتا ہے۔ پھر ان سب باتوں کے ساتھ ایک طرف یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ یہ سارے انبیاء تو جید کے قائل تھے اور اپنی حاجات ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ لے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہ بھی جانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ غیر معمولی طور پر اپنے نبیوں کی مدد کرتا رہا ہے، آغاز میں خواہ کسی ہی آزمائشوں سے ان کو سابقہ پیش آیا ہو مگر آخر کار ان کی دعائیں معجزانہ شان کے ساتھ پوری ہو جاتی ہیں۔

مراد میں حضرت مریم علیہا السلام۔

۹۹؎ پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو دنیا بھر کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔

یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس تم میری عبادت کرو۔ مگر یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ، انہوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

۱۰۰؎ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنِّیْ خَلَقْتُ لَیْسَہٗ اَمِّنْ طَبِیْعًا فَاِذَا سَوَّیْتِہٖ وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَفَعَّوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ (ص۔ رکوع ۵)۔ میں مٹی سے ایک بشر بنا رہا ہوں، پس رے فرشتو! جب میں اسے پورا بنا لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔ اور یہی بات حضرت عیسیٰ کے متعلق مختلف مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ سورہ نساء میں فرمایا۔ دَسُّوْا اللّٰہَ وَ کَلِمَتُہٗ اَلْقَہَا اِلٰی ہٰرِیْمَ وَ رُوْحٌ مِّنْہٗ (رکوع ۲۳) اللہ کا رسول اور اس کا فرمان جو مریم کی طرف القا کیا گیا اور اس کی طرف سے ایک روح ۷ اور سورہ نحریم میں ارشاد ہوا وَ صَرَّیْمَ نَبِیِّہٖ عِمْرَانَ الَّذِیْ اٰحْصٰنَتْ فَرْجَہَا فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا (رکوع ۲)۔ اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی پس پھونک دیا ہم نے اس میں اپنی روح سے ۷ اس کے ساتھ یہ امر عجیب پیش نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کی پیدائش اور حضرت آدم کی پیدائش کو ایک دوسرے کے مشابہ قرار دیتا ہے، چنانچہ سورہ آل عمران میں فرمایا اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ، خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَاَکُوْنُ (رکوع ۶)۔ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے جس کو اللہ نے مٹی سے بنایا پھر فرمایا ہو جا اور وہ موجود تھا۔ ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ معمولی طریقہ تخلیق کے بجائے جب اللہ تعالیٰ کسی کو براہ راست اپنے حکم سے وجود میں لا کر زندگی بخشتا ہے تو اس کو اپنی روح سے پھونکنے کے الفاظ سے تعبیر فرماتا ہے۔ اس روح کی نسبت اللہ کی طرف کس معنی میں ہے، او اس کے پھونکنے کا ٹھیک مطلب کیا ہے، اس کو ہم نہ جان سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۲۷-۴۲۸۔

۱۰۱؎ یعنی یہ دونوں ماں بیٹے خدا یا خدائی میں شریک نہ تھے بلکہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشان تھے۔ ”نشانی“ وہ کس معنی میں تھے، اس کی تشریح سورہ مریم رکوع ۲ کے حواشی میں گزر چکی ہے۔

۱۰۲؎ ”تم“ کا خطاب تمام انسانوں کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے انسانو! تم سب حقیقت میں ایک ہی

سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے پھر جو نیک عمل کرے گا، اس حال میں کہ وہ مومن ہو، تو اس کے کام کی ناقدری نہ ہوگی، اور اُسے ہم لکھ رہے ہیں۔ اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو وہ پھر پلٹ سکے۔ یہاں تک کہ جب یا جوج و ما جوج کھول دیئے جائیں گے اور ہر ملندی سے وہ نکل پڑیں گے اور وعدہ برحق کے پورا ہونے کا وقت قریب آگئے گا تو یکایک اُن لوگوں کے دیدے

است اور ایک ہی ملت تھے، دنیا میں جتنے نبی بھی آئے وہ سب ایک ہی دین لے کر آئے تھے، اور وہ اصل دین یہ تھا کہ صرف ایک اللہ ہی انسان کا رب ہے اور اکیلے اللہ ہی کی بندگی و پرستش کی جانی چاہیے۔ بعد میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے وہ اسی دین کو بگاڑ کر بنالیے گئے۔ اُس کی کوئی چیز کسی نے لی، اور کوئی دوسری چیز کسی اور نے، اور پھر ہر ایک نے ایک جُز اُس کا لے کر بہت سی چیزیں اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملا ڈالیں۔ اس طرح یہ بے شمار ملتیں وجود میں آئیں۔ اب یہ خیال کرنا کہ فلاں نبی فلاں مذہب کا بانی تھا اور فلاں نبی فلاں مذہب کی بنا ڈالی، اور انسانیت میں یہ ملتوں اور مذہبوں کا تفرقہ انبیاء کا ڈالا ہوا ہے، محض ایک غلط خیال ہے۔ محض یہ بات کہ مختلف ملتیں اپنے آپ کو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے انبیاء کی طرف منسوب کر رہی ہیں، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ملتوں اور مذہبوں کا یہ اختلاف انبیاء کا ڈالا ہوا ہے۔ خدا کے نیچے ہوئے انبیاء دس مختلف مذہب نہیں بنا سکتے تھے اور نہ ایک خدا کے سوا کسی اور کی بندگی سکھا سکتے تھے۔

۱۱۰ اس آیت کے تین مطلب ہیں:

ایک یہ کہ جس قوم پر ایک مرتبہ عذاب الہی نازل ہو چکا ہو وہ پھر کبھی نہیں اُٹھ سکتی۔ اس کی نشاۃ ثانیہ اور اس کی حیاتِ نو ممکن نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ ہلاک ہو جانے کے بعد پھر اس دنیا میں اُس کا پلٹنا اور اسے دوبارہ امتحان کا موقع ملنا غیر ممکن ہے۔ پھر تو اللہ کی عدالت ہی میں اس کی پیشی ہوگی۔

تیسرے یہ کہ جس قوم کی بدکاریاں اور زیادتیاں اور بدایتِ حق سے پیہم رہ گئیں انیاں اس حد تک پہنچ جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ہلاکت کا فیصلہ ہو جاتا ہے، اُسے پھر رجوع اور توبہ و انابت کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اُس کے لیے پھر یہ ممکن نہیں رہتا کہ ضلالت سے ہدایت کی طرف پلٹ سکے۔

پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنہوں نے کفر کیا تھا۔ کہیں گے "ہائے ہماری کم نحتی، ہم اس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے، بلکہ ہم خطا کار تھے۔" اُن سے کہا جائے گا "تم، اور تمہارے وہ معبود جنہیں تم پوجتے تھے، جہنم کا لقمہ ہو، وہیں تم کو جانا ہے۔ اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو وہاں

۹۳ یا جوج و ماجوج کی تشریح سورہ کہف رکوع ۱۱ کے حواشی میں کی جا چکی ہے۔ اُن کے کھول دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گے کہ جیسے کوئی تنکاری درندہ یکایک پیچھے یا بندھن سے چھوڑ دیا گیا ہو۔ وعدہ حق پورا ہونے کا وقت قریب آگئے گا۔ کا اشارہ صاف طور پر اس طرف ہے کہ یا جوج و ماجوج کی یہ عالمگیر یورش آخری زمانہ میں ہوگی اور اس کے بعد جلدی ہی قیامت آجائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد اس معنی کو اور زیادہ کھول دیتا ہے جو مسلم نے حذیفہ بن اسید الغفاری کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو۔ دُھواں، دَجَال، دَابَّةُ الارض، مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰ ابن مریم کا نزول، یا جوج و ماجوج کی یورش، اور تین بڑے خوف رزین کا وحشا یا (LANDSLIDES)۔ ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، اور تیسرا جزیرۃ العرب میں، پھر سب سے آخر میں مین سے ایک سخت آگ اٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی (یعنی بس اس کے بعد قیامت آجائے گی) ایک اور حدیث میں یا جوج و ماجوج کی یورش کا ذکر کر کے حضور نے فرمایا اُس وقت قیامت اس قدر قریب ہوگی جیسے پورے پٹیوں کی حاملہ کہیں کہیں سکتے کب وہ بچہ جن دے، رات کو یا دن کو رکال کا حامل المہتم لا یدری اہلہا متی تلجوہم بولد ہا لیلا او نہاراً)۔

۹۴ "غفلت" میں پھر ایک طرح کی معذرت پائی جاتی ہے، اس لیے وہ اپنی غفلت کا ذکر کرنے کے بعد پھر خود ہی صاف صاف اعتراف کریں گے کہ ہم کو انبیاء نے اگر اس دن سے خبردار کیا تھا، لہذا درحقیقت ہم غافل و بے خبر نہ تھے بلکہ خطا کار تھے۔

۹۵ روایات میں آیا ہے کہ اس آیت پر عبداللہ بن الزبیری نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو صرف ہمارے ہی معبود نہیں، مسیح اور عزیزا اور ملائکہ بھی جہنم میں جائیں گے، کیونکہ دنیا میں ان کی بھی عبادت کی جاتی ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نعم۔ کل من احب ان لیعبد من دون اللہ فهو مع من عبدک،

نہ جاتے۔ اب سب کو ہمیشہ اسی میں رہنا ہے۔ وہاں وہ پھنکارے ماریں گے اور حال یہ ہوگا کہ اس میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیگی۔ رہے وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے جہلائی کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہوگا، تو وہ یقیناً اس سے دُور رکھے جائیں گے؛ اُس کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے، اور

”ہاں، ہر وہ شخص جس نے پسند کیا کہ اللہ کے بجائے اُس کی بندگی کی جائے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جنہوں نے اس کی بندگی کی۔“ اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے خلق خدا کو خدا پرستی کی تعلیم دی تھی اور لوگ انہی کو معبود بنا بیٹھے، یا جو غریب اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ دنیا میں ان کی بندگی کی جا رہی ہے اور اس فعل میں ان کی خواہش اور مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے، ان کے جہنم میں جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس شرک کے فائدہ نہیں ہیں۔ البتہ جنہوں نے خود معبود بننے کی کوشش کی اور جن کا خلق خدا کے اس شرک میں واقعی دخل ہے وہ سب اپنے عابدوں کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جہنم میں جائیں گے جنہوں نے اپنی اغراض کے لیے غیر اللہ کو معبود بنوایا تھا۔ شیطان بھی اسی ذیل میں آتا ہے، کیونکہ اُس کی تحریک پر جن ہستیوں کو معبود بنایا جاتا ہے، اصل معبود وہ نہیں بلکہ خود شیطان ہوتا ہے جس کے امر کی اطاعت میں یہ فعل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پتھر اور لکڑی کے بتوں اور دوسرے سامان پرستش کو بھی مشرکین کے ساتھ جہنم میں داخل کیا جائے گا تاکہ وہ ان پر آتش جہنم کے اور زیادہ بھڑکنے کا سبب بنیں اور یہ دیکھ کر انہیں مزید تکلیف ہو کہ جن سے وہ شفاعت کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے وہ اُن پر اُلٹے عذاب کی شدت کے موجب بنے ہوئے ہیں۔

۹۶ اصل میں لفظ زُفیر استعمال ہوا ہے۔ سخت گرمی، محنت اور لکان کی حالت میں جب آدمی لمبا سانس لے کر اُس کو ایک پھنکار کی شکل میں نکالتا ہے تو اسے عربی میں زُفیر کہتے ہیں۔

۹۷ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں نیکی اور سعادت کی راہ اختیار کی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ وعدہ فرما چکا ہے کہ وہ اس کے عذاب سے محفوظ رہیں گے اور ان کو نجات دی جائے گی۔

وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی من لچھائی چیزوں کے درمیان میں گئے۔ انتہائی گھبراہٹ کا وقت اُن کو فدا پر نشان نہ کرے گا، اور مالک بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ نہیں گئے کہ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

وہ دن جبکہ آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اور اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔ جس طرح پہلے ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی اُسی طرح ہم پھر اُس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمے، اور یہ کام ہمیں بہر حال کرنا ہے۔ اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے، اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے۔

یعنی بعد محشر اور خدا کے حضور پیشی کا وقت، جو عام لوگوں کے لیے انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی کا وقت ہو گا، اُس وقت نیک لوگوں پر ایک اطمینان کی کیفیت طاری رہے گی۔ اس لیے کہ سب کچھ ان کی توقعات کے مطابق ہو رہا ہو گا۔ ایمان و عمل صالح کی جو پونجی لیے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہوئے تھے وہ اُس وقت خدا کے فضل سے اُن کی ڈھارس نہ بھائے گی اور خوف و حزن کے بجائے اُن کے دلوں میں یہ امید پیدا کرے گی کہ عنقریب وہ اپنی سعی کے نتائج خیر سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔

اس آیت کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں نے سخت ٹھوس کرکھائی ہے اور اس سے ایک ایسا مطلب نکال لیا جو پورے قرآن کی تردید اور پورے نظام دین کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔ وہ آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ زندگی میں زمین کی وراثت (یعنی حکومت و فرمانروائی اور زمین کے وسائل پر تصرف) صرف صالحین کو ملا کرتی ہے اور انہی کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے نوازتا ہے۔ پھر اس قاعدہ کلیہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صالح اور غیر صالح کے فرق و امتیاز کا معیار یہی وراثت زمین ہے۔ جس کو یہ وراثت ملے وہ صالح ہے اور جس کو نہ ملے وہ غیر صالح۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر اُن قوموں پر نگاہ ڈالتے ہیں جو دنیا میں پہلے وراثت زمین رہی ہیں اور آج اس وراثت کی مالک بنی ہوئی ہیں۔ یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ انہی شرکت دہریہ، ناسق، فاجر، سب پر وراثت پہلے بھی پاتے رہے ہیں اور آج بھی پاتے ہیں۔ ان قوموں میں وہ

تمام اوصاف پائے گئے ہیں اور آج پائے جاتے ہیں جنہیں قرآن صاف الفاظ میں کفر، فتن، فجور، مصیبت اور بدی سے تعبیر کرتا ہے، وہ اس وراثت سے محروم نہیں ہوئیں بلکہ نوازی گئیں اور آج بھی نوازی جا رہی ہیں۔ نزعون و نمرود سے لے کر اسٹالن تک کہتے ہی ہیں جو کھلم کھلا خدا کے منکر، مخالف، بلکہ برا مقابل بنے ہیں اور پھر بھی وارث زمین ہوئے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر وہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ قرآن کا بیان کردہ قاعدہ کبھی تو غلط نہیں ہو سکتا، اب لامحالہ غلطی جو کچھ ہے وہ ”صلاح“ کے اُس مفہوم میں ہے جرات تک مسلمان سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ صلاح کا ایک نیا تصور تلاش کرتے ہیں جس کے مطابق زمین کے وارث ہونے والے سب لوگ یکساں ”صلاح“ قرار پاسکیں، قطع نظر اس سے کہ وہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق ہوں یا چنگیز اور ہلاکو۔ اس نئے تصور کی تلاش میں علماء دن کا نظریہ ارتقاء ان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ قرآن کے تصور صلاح کو ڈاروینی تصور ”صلاحیت“ (FITNESS) سے لے جا کر ملا دیتے ہیں۔

اس نئی تفسیر کی رو سے آیت زیر بحث کے معنی یہ قرار پاتے ہیں کہ جو شخص اور گروہ بھی ممالک کو فتح کرنے اور ان پر زور و قوت کے ساتھ اپنی حکومت چلانے اور زمین کے وسائل کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کی قابلیت رکھتا ہو وہی ”خدا کا صالح بندہ“ ہے اور اُس کا یہ فعل تمام ”عابد“ انسانوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ ”عبادت“ اس چیز کا نام ہے جو شخص اور گروہ کر رہا ہے، اگر یہ عبادت تم نہیں کرتے اور نتیجہ میں دشتِ زمین سے محروم رہ جاتے ہو تو نہ تمہارا شمار صالحین میں ہو سکتا ہے اور نہ تم کو خدا کا عبادت گزار بندہ کہا جاسکتا ہے۔

یہ معنی اختیار کرنے کے بعد ان حضرات کے سامنے یہ سوال آیا کہ اگر ”صلاح“ اور ”عبادت“ کا تصور یہ ہے تو پھر وہ ایمان (ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالرسول اور ایمان بالکتاب) کیا ہے جس کے بغیر خود اسی قرآن کی رو سے، خدا کے ہاں کوئی عمل صالح مقبول نہیں؟ اور پھر قرآن کی اس دعوت کے کیا معنی ہیں کہ اُس نظامِ اخلاق اور قانونِ زندگی کی پیروی کرو جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ بھیجا ہے؟ اور پھر قرآن کا بار بار یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ جو رسول کو نہ مانے اور خدا کے نازل کردہ احکام کا اتباع نہ کرے وہ کافر، فاسق، عذاب کا مستحق اور منضوب بارگاہِ خداوندی ہے؟ یہ سوالات ایسے تھے کہ اگر یہ لوگ ان پر ایمان لائی

کے ساتھ غور کرتے تو محسوس کر لیتے کہ ان سے اس آیت کا مطلب سمجھنے اور صلاح کا ایک نیا تصور قائم کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی غلطی محسوس کرنے کے بجائے پوری جسارت کے ساتھ ایمان اسلام، توحید آخرت، رسالت، ہر چیز کے معنی بدل ڈالے تاکہ وہ سب اُن کی اس ایک آیت کی تفسیر کے مطابق ہو جائیں، اور اس ایک چیز کو ٹھیک ٹھکانے کی خاطر انہوں نے قرآن کی ساری تعلیمات کو الٹ پلٹ کر ڈالا۔ اس پر طبقہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کی اس مرتبہ دین سے اختلاف کرتے ہیں اُن کو یہ اُلٹا الزام دیتے ہیں کہ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔ یہ دراصل مادی ترقی کی خواہش کا بیضہ ہے جو بعض لوگوں کو اس بُری طرح لاحق ہو گیا ہے کہ وہ قرآن کی معنوی تحریف کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

اُن کی اس تفسیر میں پہلی بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو قرآن کی مجموعی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہے، حالانکہ اصولاً قرآن کی ہر آیت کی وہی تفسیر صحیح ہو سکتی ہے جو اُس کے دوسرے بیانات اور اس کے مجموعی نظام فکر سے مطابقت رکھتی ہو۔ کوئی شخص جس نے کبھی قرآن کو ایک دفعہ بھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے، اس بات سے ناواقف نہیں رہ سکتا کہ قرآن جس چیز کو نیکی اور تقویٰ اور بھلائی کہتا ہے وہ "مادی ترقی اور حکم رانی کی صلاحیت" کی سہم معنی نہیں ہے، اور "صلاح" کو اگر صاحب صلاحیت کے معنی میں لے لیا جائے تو یہ ایک آیت پورے قرآن سے ٹکرا جاتی ہے۔

دوسرا سبب، جو اس غلطی کا موجب ہوا ہے، یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے بے تکلف جو معنی چاہتے ہیں اس کے الفاظ سے نکال لیتے ہیں، حالانکہ ہر آیت کے صحیح معنی صرف وہی ہو سکتے ہیں جو سیاق و سباق سے مناسبت رکھتے ہوں۔ اگر یہ غلطی نہ کی جاتی تو آسانی کے ساتھ دیکھا جاسکتا تھا کہ اوپر سے جو مضمون مسلسل چلا آ رہا ہے وہ عالم آخرت میں مومنین صالحین اور کفار و مشرکین کے انجام سے محبت کرتا ہے۔ اس مضمون میں یکا یک اس مضمون کے بیان کرنے کا آخر کو نسا موقوف تھا کہ دنیا میں وراثت زمین کا انتظام کس قاعدے پر ہو رہا ہے۔

تفسیر کے صحیح اصولوں کو ملحوظ رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا مطلب صاف یہ ہے کہ وہ عمری تخلیق میں، جس کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں ہوا ہے، زمین کے وارث صرف صالح لوگ ہونگے اور اس ابدی زندگی

کے نظام میں موجودہ عارضی نظام زندگی کی سی کیفیت برقرار نہ رہے گی کہ زمین پر فاسقوں اور ظالموں کو بھی تسلط حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون اس سے زیادہ صریح الفاظ میں سورہ زمر کے خاتمہ پر بیان کیا گیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ قیامت اور نفع و ہلاکت اور اول و ثانی کا ذکر کرنے کے بعد اپنی عدالت کا ذکر فرماتا ہے، پھر کفار کا انجام بیان کر کے نیک لوگوں کا انجام یہ بتاتا ہے کہ وَ سَيَقُولُ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَئِذَا جَاءُوا نُحْتِثُ أَبْوَابَهَا قَالُوا لَمْ يَخُزْنَتْهَا سَلَمٌ عَلَيْكُمْ طَبَعْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدُهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝ اور جن لوگوں نے اپنے رب کے خوف سے تقویٰ اختیار کیا تھا وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچائے جائیں گے تو ان کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے منتظم ان سے کہیں گے کہ سلام ہو تم کو، تم بہت اچھے رہے، آؤ اب اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ۔ اور وہ کہیں گے کہ حمد ہے اس خدا کی جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہم کو زمین کا وارث کر دیا، اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے ۝ دیکھیے، یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون بیان کر رہی ہیں، اور دونوں جگہ وراثت زمین کا تعلق عالم آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا سے۔

اب زبور کہ لیجیے جس کا حوالہ آیت زیر بحث میں دیا گیا ہے۔ اگرچہ ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ بائبل کے مجموعہ کتب مقدسہ میں زبور کے نام سے جو کتاب اس وقت پائی جاتی ہے یہ اپنی اصلی غیر محرف صورت میں ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس میں مزایر داؤد کے علاوہ دوسرے لوگوں کے مزامیر بھی خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اور اصلی زبور کا نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔ تاہم جو زبور اس وقت موجود ہے اس میں بھی نیکی اور راست بازی اور توکل کی نصیحت کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

”کیونکہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے لیکن جن کو خداوند کی آس ہے ملک کے وارث ہونگے۔ کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا، تو اس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہوگا، لیکن حلیم ملک کے وارث ہونگے اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے۔۔۔۔“

اُسے محمدؐ، ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں رحمتِ شفیقہ ہے۔ اُن
..... اُن کی میراث ہمیشہ کے لیے ہرگی صادق زمین کے وارث ہونگے

اور اُس میں ہمیشہ بسے نہیں گئے (۳۷ داؤد کا نمبر)۔ آیات ۱۰۰-۱۱۰-۱۲۰-۱۲۹

دیکھیے یہاں راست باز لوگوں کے لیے زمین کی دائمی وراثت کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ آسمانی کتابوں
کی رو سے مخلوق اور ابدی زندگی کا تعلق آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا کی زندگی سے۔

دنیا میں زمین کی عارضی وراثت جس قاعدے پر تقسیم ہوتی ہے اسے سورۃ اعراف میں اس طرح
بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُعْرِشُ شَہَا مِّنْ نَّشَا مِّنْ عِبَادِہٖ، ”زمین اللہ کی ہے، اپنے
مبتدول میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے“، مثبت الہی کے تحت یہ وراثت مومن
اور کافر، صالح اور فاسق، فرماں بردار اور نافرمان، سب کو ملتی ہے، مگر جزائے اعمال کے طور پر نہیں بلکہ
امتحان کے طور پر، جیسا کہ خود فرمایا وَ لَیْسَتْخَ لَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرْ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ اور
وہ تم کو زمین میں خلیفہ بنائے گا پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو“ اس وراثت میں دوام اور ہمیشگی
نہیں ہے۔ یہ مستقل اور دائمی بندوبست نہیں ہے۔ یہ محض ایک امتحان کا موقع ہے جو خدا کے ایک
ضابطے کے مطابق دنیا میں مختلف قوموں کو باری باری دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آخرت میں اسی زمین
کا دائمی بندوبست ہوگا، اور قرآن کے متعدد واضح ارشادات کی روشنی میں وہ اس قاعدے پر ہوگا کہ زمین
اللہ کی ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے صرف مومنین صالحین کو اس کا وارث بنائے گا، امتحان کے طور پر
نہیں، بلکہ اُس نیک رویے کی ابدی جزا کے طور پر جو انہوں نے دنیا میں اختیار کیا۔

نقلہ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے“
دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دراصل نوع انسانی کے لیے خدا کی
رحمت اور مہربانی ہے، کیونکہ آپ نے اگر غفلت میں پڑی ہوئی دنیا کو چوڑکا دیا ہے، اور اُسے وہ علم
دیا ہے جو حق اور باطل کا فرق واضح کرتا ہے، اور اس کو بالکل حیر مشتبہ طریقہ سے بتا دیا ہے کہ اس کے
نیچے تباہی کی راہ کو نہی ہے اور سلامتی کی راہ کو نہی۔ کفار بلکہ حضور کی بعثت کو اپنے لیے رحمت اور مصیبت

کہو "میرے پاس جو وہی آتی ہے وہ یہ ہے کہ تم ہمارا خدا صرف ایک ہے، کیا تم میرا خدا سمجھتے ہو؟ اگر وہ منہ پھیرے تو کہہ دو کہ "میں نے علی الاعلان تم کو خبر دیا کہ وہ ایک ہے۔ اب یہ نہیں چاہتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے قریب سے یا دور۔ اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو باور بلند کبھی نہ ہوتی ہیں اور وہ بھی جو تم چھپا کر کرتے ہو۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید یہ دو ہیں تمہارے لیے ایک فتنہ ہے اور تمہیں ایک وقت خاص تک کے لیے فرے کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔"

آخر کار رسول نے کہا کہ "اے میرے رب، حق کے ساتھ فیصلہ کر دے، اور لوگوں کو تم جو باتیں بتاتے ہو ان کے مقابلے میں ہمارا رب رحمان ہی جیسے لیے مدد کا سہارا ہے۔"

سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس شخص نے ہماری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ نائنس سے گوشت جدا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر فرمایا گیا کہ نادانو! تم جسے زحمت سمجھ رہے ہو یہ حقیقت میں تمہارے لیے خدا کی رحمت ہے۔ اللہ اپنی خدا کی پکڑ جو دعوتِ رسالت کو رد کرنے کی صورت میں آئے گی، خواہ کسی نوعیت کے عذاب کی شکل میں آئے۔

۱۰۰ اشارہ ہے ان مخالفانہ باتوں اور سازشوں اور سرگوشیوں کی طرف جن کا آغاز سورہ میں ذکر کیا گیا تھا۔ وہاں بھی رسول کی زبان سے ان کا یہی جواب دیا گیا تھا جو باتیں تم بنا رہے ہو وہ سب خدا کی رہا ہے اور جانتا ہے۔ یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ ہوا میں اڑ گئیں اور کبھی ان کی باز پرس نہ ہوگی۔

۱۰۱ یعنی تم اس تاخیر کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو۔ تاخیر تو اس لیے کی جا رہی ہے کہ تمہیں سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دی جائے اور جلد بازی کر کے فوراً ہی نہ پکڑ لیا جائے۔ مگر تم اس سے اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہو کہ نبی کی سب باتیں چھوٹی ہیں ورنہ اگر یہ سچا نبی ہوتا اور خدا ہی کی طرف سے آیا ہوتا تو اس کو جھٹلا دینے کے بعد ہم کبھی کے دھریے گئے ہوتے۔